لہو رنگ

سیفی امروہوی

چند سال قبل رامپور کی زراعتی نمائش میں ایک شعر
بہت مقبول ہوا اور آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ وہ شعر
یہ ہے ؎ تری نگاہ نے محفل میں دفعتاً اٹھ کر
کسی کا حال بگاڑا کسی کا مستقبل

شعر واقعی پر اثر بھی ہے اور بے تکلف و بے تصنع بھی۔ مجھے حال
ہی میں جناب شمیم امروہوی کے ذریعہ منتخب اشعار دیکھنے کا
موقع ملا تو اس میں یہ شعر بھی تھا۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ سیفی
صاحب کے کلام میں اس شعر کے علاوہ اور بھی بہت سے خوبصورت
اشعار موجود ہیں۔ وہ غزل کے مزاج کو برتنے کا اچھا سلیقہ رکھتے
ہیں۔ ظاہر ہے کہ اشعار میں حُسن۔ ذوق اور نظر سے پیدا ہوتا ہے اور
سیفی صاحب ان دونوں سے بہرہ ور ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

امتیاز علی عرشی

حضرت رئیس امروہوی اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "تمہارے
یہاں روایت کو ضعف پہنچائے بغیر جدت اظہار اور جدت افکار پائی جاتی
ہے"

رئیس امروہوی

لہو رنگ

سرخیٔ مری روداد الم کی ہے لہو رنگ
افسانے کا عنوان ہی افسانہ کہے ہے

سیفی امروہوی

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

پہلی بار	:	مئی ۱۹۸۰ء
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
طابع	:	جمال پریس ۔ دہلی
خوشنویس	:	بزمی امروہوی
ناشر	:	زبیر مرزا
قیمت	:	15/ پندرہ روپیہ

زیر اہتمام

انجمن ترقی اردو کل ہند (شاخ امروہہ)

ملنے کے پتے

- مرزا محمد زبیر ابن سیفی ۔ محلہ صدو امروہہ ۔
- دفتر انجمن ترقی اردو (شاخ امروہہ) ۔
- تنویر بک ڈپو ۔ گشتبان اسٹریٹ امروہہ ۔

انتساب

ان تمام صاحبان ذوقِ سلیم کے نام
جنھیں میری آواز اپنی آواز معلوم
ہوتی ہے۔

سیفی امروہوی

اپنی بات

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ امروہہ اپنے روز قیام ہی سے متحرک اور فعال جماعت رہی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر احسان حسین صاحب کی جد و جہد اور کوشش سے انجمن کی شاخ امروہہ کا قیام عمل میں آیا لیکن بدقسمتی سے اس کے قیام کے ایک سال بعد ہی اردو کیلئے ایسا برآشوب دور شروع ہو گیا جسمیں ترقی کی بات سوچنا تو درکنار بقاء کا مسئلہ پریشان کن بن گیا تھا لیکن آفرین ہے ڈاکٹر صاحب اور انجمن کے اس وقت کے مخلص کارکنوں کی جہ ارت پر کہ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اردو کی حمایت میں زائد از پچاس ہزار دستخط فراہم کر کے امروہہ اور انجمن کی لاج رکھی۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن کے صدر سید سخی حسن اور سکریٹری سید عنبر حسن منتخب ہوئے۔ ان حضرات نے ممبر سازی کی مہم چلائی۔ دستور العمل تیار کر کے شائع کرایا اور انجمن کا مرکز سے الحاق کرا کے اس شاخ کو ایک منضبط جماعت بنا دیا۔ ۱۹۵۴ء میں سید سخی حسن صاحب کے زیر اہتمام "یوم مصحفی" مصحفی کے شایان شان منایا گیا جس میں پروفیسر احتشام حسین اور خواجہ احمد فاروقی جیسی عظیم المرتبت شخصیتوں نے شرکت فرمائی۔ اس کے بعد صدر انجمن حکیم آفتاب احمد خاں جامعی کی درخواست پر ڈاکٹر سید محمود وزیر دفاع امروہہ تشریف لائے اور رفیع احمد قدوائی لائبریری کا

سنگ بنیاد رکھا حکیم سعادت اللہ صاحب نے اپنے زمانۂ صدارت میں میونسپل بورڈ امروہہ سے انجمن کی ماہانہ امداد مقرر کرائی اور پھر حکیم صیانت اللہ صاحب نے اپنے صدارتی دور میں انجمن کے زیر اہتمام اردو کالج قائم کیا۔ اور اردو کے طلباء کو وظائف مقرر کئے ۱۹۷۶ء سے انجمن کے صدر حکیم کلب علی صاحب شاہد جو اس پہلے بھی دو مرتبہ انجمن کے صدر منتخب ہو چکے ہیں۔ اور سکریٹری راقم الحروف ہیں۔ اس وقت بھی انجمن کے سامنے بہت سے پروگرام ہیں جنھیں عملی جامہ پہنانا ہے۔ جناب سیفی امروہوی کے مجموعۂ غزلیات "لہو رنگ" کی اشاعت اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

انجمن کے اس مختصر سے تعارف کے بعد میں شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جناب سیفی کا کہ انھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کی اجازت دی اور ان کے تمام مخلصین کا جنھوں نے دامے، درمے۔ سخنے امداد فرمائی۔ نیز انجمن کے معاونین کا جن کا تعاون مجھے ہر قدم حاصل رہا۔ آخر میں بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ یہ مجموعہ مقبول ہو۔ اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ آمین

شوق امروہوی
ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو
(شاخ امروہہ)

غزل اور سیفی

اردو محض ایک زبان نہیں، ایک تہذیب بھی ہے۔ اور اس تہذیب کی روحِ رواں ہے غزل، جس کا نام سنتے ہی ذہن میں رنگا رنگ کیفیات کے ان گنت دریچے کھل جاتے ہیں۔ اس خوبصورت صنفِ سخن پر مولانا حالی کے دور سے کلیم الدین احمد تک کیسے کیسے نکتہ چیں نہ پڑے مگر بحمداللہ وہ زندہ و سلامت رہی اور اپنی خوش آہنگی، طرب خیزی اور غم نوازی سے اپنے شیدائیوں کو "ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ" سکھاتی رہی۔ غزل کی اس توانائی اور تابِ مقاومت کا راز کئی باتوں میں مضمر ہے۔ اوّلاً یہ کہ غزل بنیادی طور پر نغمہ ہے اور نغمے سے دلچسپی انسانی سرشت میں داخل ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ اربابِ نشاط کی محفلیں ہوں یا سماع کے مقدس جلسے، فلمیں ہوں یا بے تکلف احباب کی نجی صحبتیں، غزل کی سحر آفرینیوں سے کوئی محفوظ نہیں۔ غزل کی مقبولیت کا دوسرا اہم سبب اس کا وہ رمزیاتی اسلوب ہے جس نے اس کو ذات، زبان اور مکان کی قیود سے آزاد کر کے ایسی آفاقیت اور ہمہ گیری عطا کی ہے کہ کوئی بھی شخص ہو کسی بھی زمانے یا کسی بھی مقام سے تعلق رکھتا ہو اسے غزل کے آئینے میں اپنے ہی مستور جذبات اور ناآسودہ خواہشات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ بقولِ اقبال ؎

کہنی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یا محمل میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ غزل ہمارے خوابوں کی داستان ہے۔ وہ خواب جو ہم جاگتے میں دیکھتے ہیں اور جو مظہر ہوتے ہیں۔ ہماری اُن آرزوؤں اور اندیشوں کے جن کی تکمیل کی ہم میں سکت یا تردید کی قوت نہیں ہوتی۔ یہ دبی ہوئی آرزوئیں اور جھٹلائے ہوئے اندیشے تحت الشعور کی کمیں گاہوں میں بیٹھے برابر ہم پر وار کرتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دِل سدا کے لئے احساسِ محرومی کا جہنم کدہ بن جاتا ہے۔ غزل کا شاعر اس جہنم کدے کو ہمارے تحت الشعور سے نکال کر شعور کی سطح پر لے آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم جب اپنی ہی محرومیوں کا حال شاعر کی زبان سے سنتے ہیں تو بےساختہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ اور اس طرح دلِ حرماں نصیب کو تسکین خاطر کا کچھ سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

ان معروضات کی وضاحت مطلوب ہو تو مرزا احمد حسین سیفی امروہوی کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیجئے۔ سیفی میرے ہم وطن ہیں اور ہم جماعت بھی۔ امروہے کی مردم خیزی ضرب المثل ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس نے اردو شاعری کو میر سعادت علی سعادت اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی جیسی شخصیتیں عطا کیں جن کے بغیر ادب اردو کی ہر تاریخ ناقص و نامکمل تصور کی جائے گی۔ اسی امروہے کے محلہ "دربارِ شاہ ولایت" میں کوئی اڑنچاس سال پیشتر سیفی کی ولادت ہوئی۔ اُن کے پدر بزرگوار جناب مرزا عبدالرؤف بیگ صاحب رؤف امروہوی جو امروہہ کے ایک مشہور تعلیمی ادارے امام المدارس کی طویل ملازمت سے بحیثیت معلم سبکدوش ہونے کے بعد اب گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں، اردو کے نعت گو شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سیفی صاحب نے شعر و سخن کی آغوش میں تربیت

پائی ہے اور شاعری انھیں ورثہ میں ملی ہے۔

سنہ ۵۱ء میں سیفی صاحب کی شادی ہوئی جس نے انھیں امروہہ [illegible] و ادبی صحبتوں سے قریب تر کر دیا۔ اُن کے برادر نسبتی حکیم کلب علی صاحب شاہد صرف ایک طبیب حاذق ہی نہیں ایک نکتہ سنج شاعر اور شعر و شاعری کے نبض شناس بھی ہیں۔ اُن کا دولت خانہ امروہہ کے صاحبان علم و فضل کا مرکز ہے۔ اور اس مرکز سے سیفی صاحب کو استفادہ کرنے اور اپنی شعری صلاحیتوں کو جلا دینے کا خوب موقع ملا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا فخر ہے کہ آج امروہے کے شعری حلقوں میں جو اعتبار و اعزاز سیفی کو حاصل ہے وہ ہماری نسل کے شعراء میں جون ایلیا (مقیم حال پاکستان) کے سوا کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا۔ سیفی اپنی مسلسل علالت کے باوجود امروہے میں اردو شاعری کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور آج کتنے ہی نوجوان شعراء بسلسلۂ شعر اُن سے وابستہ ہیں اور فیوض تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

ان چند تعارفی کلمات کے ساتھ سیفی صاحب کے جستہ جستہ اشعار جو زیر نظر مجموعے سے بغیر کسی انتخابی کاوش کے نقل کر لئے گئے ہیں۔ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے شاعر کی قادر الکلامی، ندرت اسلوب، اور رسائی فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آئینہ دیکھ کے دیتے ہیں مجھے داد سخن
جب کوئی میری غزل اُن کو سنا دیتا ہے

ذہن سے تیرے خیالوں کا تسلسل نہ ہٹا
وادیِ دل سے گزرتے رہے محمل کتنے

ضبط، ایثار، وفا، مہر، مروت، اخلاص
میں ہوں مقتل میں اکیلا مرے قاتل کتنے

تری نگاہ نے محفل میں دفعتہً اٹھ کر
کسی کا حال بگاڑا، کسی کا مستقبل

میری بالیں پہ آ کے بتلا دو
موت کا وقت کیسے ٹلتا ہے

دیوانہ تو دیوانہ ہے دیوانے کی بات ہی کیا
دیوانے ہیں، دیوانے کو آئے جو سمجھانے لوگ

راس کسی انداز سے آئی ہے رسوائی مجھے
اک زمانہ کہہ رہا ہے ان کا سودائی مجھے

پھولوں کو مہکنے کے آداب نہ آتے تھے
خوشبو تری زلفوں کی پھولوں میں بسا دی ہے

عرضِ غم کی شکایت ہے اب تک انہیں
اک غزل ہو گئی تھی بہت دن ہوئے

مجھے جنت سے رخصت کرنے والے یہ بھی سوچا تھا
اسے اس آگئی دنیائے آب و گل تو کیا ہوگا

اشک ریزی سے مجھے روکنے والے یہ بتا
کیوں چھلک پڑتے ہیں وہ جام جو بھر جاتے ہیں

رفتار ہے منجملہ آثارِ قیامت
گفتار کے انداز میں تیور ہیں غزل کے

ضبطِ گریہ کے مراحل بھی ہیں دو بھر کتنے
پینے پڑتے ہیں ان آنکھوں کو سمندر کتنے

یہ تیرگی ہی بھلی ہے جو تا حیات چلے
تمام عمر ترے گیسوؤں کی رات چلے

کشتِ غزل کو سینچا ہے یوں اپنے خون سے
شعروں میں لفظ لفظ سجا کر غزل کہی

حقیقت یہ ہے کہ سیفی صاحب نے کشتِ غزل کو اپنے خون سے سینچا ہے لیجئے آپ بھی اس کشتِ لالہ زار کا نظارہ کیجئے اور لطف اٹھائیے۔

(ڈاکٹر) سید منظر عباس نقوی
ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۶ مارچ ۸۰ء

سیفی۔ فکر و فن

شاعر کے ذہن میں خام مواد پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ تاثر، تجربہ، مشاہدہ اور تجربے کی گرمی اس خام مواد کو سیّال بنا دیتی ہے اور فکر کا کوہ آتش فشاں اسے پگھلے ہوئے لاوے کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ لاوا کشاکش پنہاں کی گرمی سے ذہن و ضمیر میں اپنے زلزلہ فگن عمل سے تزقید و ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ جسے کرب تخلیق سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ شاعر پہلے ہیولیٰ اور ہیئت بناتا ہے پھر اس ہیولیٰ میں اپنے ذہنی نفس گرم سے روح پھونکتا ہے اور شعر کے چوکھٹے میں لگا دیتا ہے۔

شعر تار حریر دو رنگ ہوتا ہے۔ خام مواد کی نوعی خاصیت و تشخص بھی اس میں ہوتا ہے۔ اور جذبے، مشاہدے اور تاثر سے نزع والم کی انبساطی اور انقباضی صورت متشکل کا بھی شعر اظہار کرتا ہے۔ شعر کے بطن میں عظیم مدّ و جزر، عظیم غلغلہ، عظیم جوش و خروش شاعر کے احساس، رجحان اور تاثر سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کبھی کبھی اپنے محرک و منشاء سے بے خبر رہتا ہے اور کچھ وقت گذر جانے پر یہ نقش شاعر پر اپنے تخلیقی مقصد و محرک کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ الہامی یا باطنی رصدگاہ ہے۔ جسے شاعری و شعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ الفاظ شعر کا جامہ نہیں۔ خود شعرا اور شعر کے افشاء و ارسال ہوتے ہیں۔ شعر ان الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جسے شاعر کے واردات و افکار اپنے

من پسند سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ غزل کا ایجاز ہی اطناب ہے اور یہ اطناب اپنے ضمیر و مفہوم کے اعتبار سے وسیع و عریض ہوتا ہے۔ غزل کی رمزیت و اشاریت ایک پر غوغا بحر ناپیدا کنار کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہوتی ہے۔ غزل میں موجوں کے تلاطم، موجوں کی تنظیم و ترتیب کو کبھی کبھی مطلع سے مقطع تک ایک ہی رنگ و آہنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ غالب کی یہ غزل شہر آشوب کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی غزل مسلسل ہے ؎

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل!
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اکثر غزل کا ہر شعر خاص تاثر کی تخلیق ہوتا ہے۔ غزل بیشتر اور عام طور پر فرد فرد اشعار اور متضاد و متخالف اظہار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کسی شعر میں وصل کی سرمستی اور کسی میں ہجر گزیدگی ہوتی ہے۔ کوئی شعر موسم بہار کا گیت ہوتا ہے اور کوئی خزاں کا نوحہ۔ مشاہدات کا تواتر، لیل و نہار کے سرد و گرم شاعر کی شمع فکر کو کبھی تمازت آفتاب بن کر اور کبھی تمنا کی آگ بن کر پگھلاتے رہتے ہیں۔ خارج و ظواہر کی کیفیات سے بھی شاعر متاثر ہوتا ہے اور باطنی کشاکشوں کو بھی شاعر نطق شعر عطا کرتا ہے۔ گرد و پیش کے شور و شیون سے اور مختلف حالات سے بھی شاعر کا نفس اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح اپنی ذات کے نہاں خانوں کی گرمئ محفل سے شاعر سے ماحول کو چھینا نہیں جا سکتا۔ اور ماحول بھی شاعر کو نہیں چھین سکتا۔ شاعر اپنا بھی ترجمان ہوتا ہے اور دوسروں کا مفسر بھی۔ شاعر کی رمز شناسی تعین ذات کی چہار دیواری میں مقید نہیں رہتی۔ یہ تو ہر متنفس کے راز و رمز اور ہر شخص کے دکھ درد کا عرفان رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے فن کی ترسیل و تبلیغ تمام عالم انسانیت کے لئے ہوتی ہے ؎

جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اردو غزل کی تاریخ غم، نامرادی، مہجوری، یاس اور زندگی سے گریز پائی کو فانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ فانی کو رشید احمد صدیقی نے یاسیت کا امام، جوش نے بیوۂ عالم اور قاضی عبدالغفار نے بیسویں صدی کی غمگین روح کے القاب دیئے ہیں۔ فانی فنا کے قائل ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری فنا کی طرف لے جانے والی شاعری ہے۔ فانی کے افکار زندگی سے فرار ہی کا سبب نہیں بنتے بلکہ قاری کو فنا مقام بننے کا سبق بھی دیتے ہیں۔ فانی کے فن میں غم سے چھٹکارا ہٹ نہیں اکتاہٹ ہے اور یہ اکتاہٹ ملال و مایوسی کی حد تک ہے۔ فانی زندگی کے قدر آشنا نہیں بننا چاہتے تماشائے حیات کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہی گذر جانے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ اس شاعری کو آپ برائے شاعری تو کہہ سکتے ہیں فن برائے زندگی کا نام نہیں دے سکتے دنیائے ممکنات، عالم انسانیت، بطن بشر کے اسرار و غوامض، دل کی دنیا کا پھیلاؤ ضمیر و ذہن کا تابندہ تموج، خود شناسی کی برکات، حب ذات کے فیوض یقین کی محکمیت، تب و تاب زندگی، یہ تمام عناوین فانی کے یہاں تشنہ ہیں۔ فانی کو پڑھنے والا خود کو بیت، از کار رفتہ و سپر انداختہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

سیفی کی شاعری زندہ ارکان و عناصر کی شاعری ہے سیفی بقا اور جہد للبقا کے شاعر زیادہ ہیں کشمکش حیات کے خار زاروں سے سیفی جوئے نغمہ خواں بن کر گذرتے ہیں۔

پھیلا کے لہو کی سرخیوں کو ترئین حیات کر رہا ہوں
ہم اہل عزم و عمل و ہم کے اندھیروں میں لہو سے اپنے چراغ یقیں جلا کے چلے

پہلے سیفی کو غموں نے آزمایا اور اب سیفی غموں کو آزما رہے ہیں سیفی کے شعور غم نے خود کو غموں سے مایوس ہی نہیں کیا۔ بلکہ اب غم سیفی کی پناہ میں ہیں سیفی نے علاج

بالمثل کو آزمودہ بھی بنایا اور بدرقۂ غم بھی۔ سیفی اپنے شعوری تجربات کی اس منزل میں ہیں کہ ہر غم کو پوٹنٹائز POTENTISE کر کے غم کا کامیاب علاج ٹھیک اسی ملکانی انداز سے کرتے نظر آتے ہیں جس طرح ہومیوپیتھی میں زہر کا علاج زہر سے کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سیفی نفسیات غم شناسی کے باب میں ایک اضافہ ہیں، ایک علامت ہیں اور ایک سنگ میل ہیں۔ سیفی زندگی کے ناہموار راستوں سے ہنستے، گنگناتے گذرتے ہیں۔ حالات کی شدت جبر نے انھیں ایسے اشعار کہنے پر بھی مجبور کیا ہے جن میں ان کی روح نوحہ کناں ہے۔ نامرادی کی جھلاہٹ اور مایوسی کی کڑواہٹ ملتی ہے لیکن یہ ایسے مقامات سے انگڑائی لیتے ہوئے فوراً آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کے یہاں طلب و تمنا کے تجمل کی روشنی زائد ہے اور یاس کے اندھیرے کم۔ مگر ہیں ضرور۔ کاش کہ یہ اندھیرے نہ ہوتے تو زیادہ اچھا تھا۔ سیفی کا کاروان فکر مسلسل سرگرم عمل ہے اس لئے وہ دن دور نہیں جبکہ ان کی شاعری کو رجائی شاعری کا نام دیا جا سکے۔ سیفی کے یہاں ؎ ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

سیفی غم کی داروپی کر منہ زور بناتے ہیں۔ یہ نشہ انھیں نشاط و سرور بھی عطا کرتا ہے اور کسل مندی بھی۔ جب خمار غم سے سیفی کی رگ رگ ٹوٹنے لگتی ہے۔ تو یہ غیر ارادی طور پر شکوے پر اتر آتے ہیں۔ شکوہ بجائے خود ساز تمنا کا ارتعاش ہے اور جرأت تمنا کا غماز بھی۔ کہیں کہیں سیفی کا شکوہ شیون بن گیا ہے اس مقام پر قاری کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ طائر بلند بام زیر دام پھڑپھڑا رہا ہے سیفی پر یہ جذبہ مستولی نہیں رہتا۔ یہ بہت جلد دام کے حلقے کاٹ کر پرواز آمادہ ہو جاتے ہیں۔

سیفی کے یہاں انتظار سحر کا تکیہ قوی انداز میں ملتا ہے۔ غم نے ان کے ہاتھ سے تلوار چھینی نہیں ہے بلکہ دوسرے ہاتھ میں مقابلہ کے لئے سپر دیدی ہے اسی لئے سیفی حیات کے کسی مرحلے میں بھی سپر انداختہ نظر نہیں آتے۔ غم نے انھیں

نشاط و سرور کی اور مصائب کو انگیز کرنے کی سکت بخشی ہے۔ حوصلہ مندی اور عزم کی پختگی نے انھیں شاد عظیم آبادی کے اس شعر کا مصداق بنا دیا ہے کہ ؎

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

سیفی روایتی شاعری کے نمائندہ ہیں۔ اقبالؔ کے مطالعہ نے انھیں کہیں کہیں روایت سے آگے بڑھایا ہے مگر ان کے فکر و فن کا تانا بانا اگر روایت پرستی نہیں تو روایت پسندی کا ساختہ پرداختہ ضرور ہے۔ یہ اپنی مستولی کیفیت کو، اپنے تاثر کی شدت کو اور اپنے جذبات کی ہماہمی کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں اور بیشتر مقامات پر ان کی کوشش کو سعیٔ مشکور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری ابھی پختگیٔ فکر کی تلاش میں ہے اور صاحب طرز شاعر بننے کی ریاضت میں مصروف ہے اور ان کی مشق شعر گوئی مزید ذہنی مکاشفات کی منتظر ہے سیفی اپنے ذہنی خد و خال، اپنے شبانہ روز کے مشاغل اور اپنے خیالات کے اعتبار سے ایک مرصع اور سانس لیتی ہوئی غزل ہیں غزل نے انھیں کتنا سنوارا ہے اور انھوں نے غزل کی مشاطگی کس حد تک کی ہے اس کا فیصلہ قارئین خود ہی فرمالیں گے۔۔

چونکہ سیفی نے شاعر باپ کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے اس لئے سیفی بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں ؎ع ؎
مرا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ تھا

سیفی کے گھر کا ماحول متصوفانہ اور شاعرانہ تھا۔ ان کے یہاں باطن کے چراغ کی لو سر ابھارتی ہوئی، تھرتھراتی ہوئی اور دل بیدار و دست بکار کی روشنی پھیلاتی ہوئی ملتی ہے۔ میری بزم "زمزمۂ غم بنا شاد" نے اور اقبال کے بقدر ظرف مطالعے نے ان کے خیالات کو وسعت بخشی اور روائتی شاعری کی کورانہ تقلید سے انھیں محفوظ رکھا۔ غم جاناں اور غم دوراں نے سیفی کو دل گداختہ عطا کیا۔ خلق، وم وتا اور

ایثار و دردمندی کی سوغات دی۔ ان کے یہاں بغاوت کم اور سمجھوتہ کرنے کی سعی زیادہ ہے۔ لگے بندھے ترقی پسندانہ طمطراق سے اور اشتراکیت کے ادب احمریں سے جان بوجھ کر اپنا دامن بچایا ہے۔ غم کی دل آویزیاں، معتقداتی فکر کی پرچھائیاں، احترام انسانیت کی نغمہ خوانیاں ان کے فن کی وہ قاریں ہیں جنھوں نے سیفی کو غزل کے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب لیجا کر کھڑا کر دیا ہے۔

میں نے عام روش سے ہٹ کر بعض خصوصیات کی نشاندہی کر دی ہے۔ اشعار سے استناد نہیں کیا۔ یہ قاری کا کام ہے۔ میں دوسروں کا کام انجام دے کر اپنی پسند کی چھاپ سے پڑھنے والوں کے ذہن کو کیوں متاثر کروں۔ انجمن ترقی اردو (کل ہند) شاخ امروہہ کی جانب سے سیفی کا مجموعۂ اشعار "لہو رنگ" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے جس کا استخراج سیفی ہی کے ایک مصرعہ سے کیا گیا ہے۔ یہ پیش کش سیفی کی خدمت تو کیا اس دور کی غزل کی خدمت تصور کی جا سکتی ہے۔ میں اس خدمت کو باحسن وجوہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اگر شوق امروہوی (ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو (کل ہند) شاخ امروہہ) ترتیب و تدوین اور کتابت و طباعت کے مراحل میں گہری دلچسپی نہ لیتے۔ انجمن بہت جلد غالب و اقبال پر بلند و گرانمایہ مضامین کے وہ مجموعے بھی پیش کرنے والی ہے جو مختلف ادبی و تنقیدی اجتماعات میں امروہہ کے صاحبان ذوق پڑھتے رہے ہیں اور داد تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔

(حکیم) کلب علی شاہد امروہوی
صدر انجمن ترقی اردو (کل ہند) شاخ امروہہ

"بنام جہاں دار جاں آفریں"

میں اپنے بارے میں تو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سن شعور سے اب تک کا عرصہ جو اپنی وسعت میں تقریباً ایک تہائی صدی پر پھیلا ہوا ہے بے پناہ فطری محرومیوں کے نتیجے میں بیشمار غیر فطری محرومیوں کے ساتھ گذارنے پر مجبور رہا ہوں نتیجۃً انتہائی جاں آزما حالات سے نبرد آزمائی اور مختلف بیماریوں کے طویل و مسلسل حملوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاعری کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے اس فن کے تمام محاسن کو کما حقہٗ حاصل کرنے کا حق ادا کیا ہے البتہ ذوق شعری مجھے ورثے میں ملا ہے۔ اور شعر گوئی میری فطری صلاحیت ہے۔ اس شعری مجموعے میں میں نے اپنے جذبات و احساسات کو فن کی تمام قیود کے ساتھ پیش کر دینے پر اکتفا کیا ہے جتنا جس احساس سے متاثر ہوا ہوں اتنا ہی اس کی ادائگی کیلئے اپنی بساط بھر مناسب الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اپنے ضمیر و قلب پر وارد ہونے والے احوال و تاثرات کو اور اپنی جراحتوں کو شعری جامہ پہنا دیا ہے۔ اگر میرے اشعار پڑھ کر قارئین میرے باطنی کرب تک پہنچ سکے تو میں خود کو کامیاب سمجھوں گا۔

میں انجمن ترقی اردو (کل ہند شاخ امروہہ) کے جملہ اراکین اور اپنے تمام معاونین و مخلصین خصوصاً عزیزم منور امروہوی، برادرم مشکور نقوی امروہوی اور مخلصی شمیم نقوی امروہوی کیلئے سراپا سپاس ہوں کہ ان تمام حضرات کی پُرخلوص کوششوں اور تعاون کے نتیجے میں "لہو رنگ" کی معرفت آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی اُن تمام اہل قلم حضرات کا بھی ممنون و متشکر ہوں جنہوں نے میرے کلام پر اپنی گراں قدر آراء کا اظہار فرما کر اسکی حیثیت میں اضافہ فرمایا۔ فقط

سیفی امروہوی

خدایا قادرِ مطلق خدایا!
متاعِ نورِ ایمان و یقیں دے

نبی سے مانگتا ہوں عشق تیرا
تو سوزِ عشقِ ختم المرسلیں دے

مرے افکار کو دے مقصدیت
نوا کو میری سوزِ آتشیں دے

ہوں ذہن و جسم صحت مند جس سے
اک ایسا جامِ صحت آفریں دے

ہے سیفی بے نگیں خاتم الٰہی
تو اس خاتم کو تابندہ نگیں دے

○

میرا باطن مرے ظاہر کو جلا دیتا ہے
میرا ظاہر مرے باطن کا پتہ دیتا ہے

ان کا غم دیکھے مجھے خوئے وفا دیتا ہے
درد کے ساتھ ہی اللہ دوا دیتا ہے

آئینہ دیکھ کے دیتے ہیں مجھے داد سخن
جب کوئی میری غزل انکو سنا دیتا ہے

ابتدا میں تو دھڑکنے سے بھی گھبراتا تھا
اب مجھے دل کا تڑپنا بھی مزا دیتا ہے

شدت درد کا یہ حال الٰہی توبہ
درد اٹھتا ہے تو ایسے کہ بٹھا دیتا ہے

تلخ حالات میں نکلا ہوا بے ساختہ شعر
کتنے چہروں سے نقابوں کو اٹھا دیتا ہے

یوں جگا دیتا ہے احساس کی قدروں کو ضمیر
جیسے کوئی کسی مجرم کو سزا دیتا ہے

عہدِ ماضی نے تڑپ بخشی تھی آزادی کی
آج کا دور ہمیں دیکھئے کیا دیتا ہے

کون ہوتا ہے تصور سا مصور صفی
یہ خلاؤں میں بھی تصویر بنا دیتا ہے

○

انکی محفل میں بھی پامال ہوئے دل کتنے
آکے ڈوبے ہیں سفینے لبِ ساحل کتنے

آج ہر شعر کی تخلیق پہ محسوس ہوا
آپ کبھی ہیں مرے افکار میں شامل کتنے

مطمئن اپنی تباہی پہ بھی ہو جاتے ہیں
ہم وفا کیش ہیں تقدیر کے قائل کتنے

ذہن سے تیرے خیالوں کا تسلسل نہ ہٹا
وادیٔ دل سے گزرتے رہے محمل کتنے

تیرا غم، تیری تمنا، تری یادیں، ترا ذکر
فرصتِ زیست ہے کم اور مشاغل کتنے

ذوقِ سجدہ سے میں ہوں سرشار مجھے کیا معلوم
فرض کتنے ہیں محبت میں نوافل کتنے

غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ فردا، غمِ جاں
ایک دل ہے مگر اس دل کے مسائل کتنے

ضبط، ایثار، وفا، مہر، مروت، اخلاص
میں ہوں مقتل میں اکیلا مرے قاتل کتنے

شوقِ منزل تھا جنھیں مجھ سے زیادہ سیفی
یاد آئے ہیں مجھے وہ سرِ منزل کتنے

○

جنوں نصیب ہے دار فتگی کا مستقبل
ہے بیخودی سے حسیں بے خودی کا مستقبل

امانتِ غمِ جاناں کی خیر ہو یا رب!
خرد نہ ہو مری دیوانگی کا مستقبل

یہی بچوڑ تو صدیوں کے تجربات کا ہے
خوشی ہے غم کا، تو غم ہے خوشی کا مستقبل

فروغِ مہر بھی مانگا ہوا اجالا ہے
سیاہ رات ہے اس روشنی کا مستقبل

کشاکشِ غمِ ہستی عذاب بن جائے
کہیں جو موت نہ ہو زندگی کا مستقبل

تری نگاہ نے محفل میں دفعتاً اٹھ کر
کسی کا حال بگاڑا کسی کا مستقبل

عذابِ کرب سے شاید نجات مل سکے
نہ ہو جو بے خبری آگہی کا مستقبل

زمانہ لاکھ ترا شے صنم خداؤں کے
"خلیلیت" ہے ہر اک آذری کا مستقبل

ملے حیات تو ذوقِ نمو بھی پیدا کر
چمن میں خندۂ گل ہے کلی کا مستقبل

نکل کے خلد کی تنہائیوں سے اے عیسیٰ
بہت بلند ہوا آدمی کا مستقبل

○

یوں تو آبادی کا اک عالم ہر اک محفل میں ہے
انکی یادوں سے اک آبادی ہمارے دل میں ہے

اختیار و جبر کے مابین پس کر رہ گیا
واقعی انسان بے چارہ بڑی مشکل میں ہے

اہل ہمت آج بھی ہیں مبتلائے امتحاں
مستقل سی اک لڑائی کشتی و ساحل میں ہے

حال صحت مند ہو تو غم سے ملتی ہے نجات
آج کا انسان لیکن فکر مستقبل میں ہے

اس کے آگے ہیچ ہے انساں کی نظروں میں بہشت
جانے کیا ایسی کشش دنیائے آب و گل میں ہے

ہم نہیں ہیں اس غلط فہمی میں سیفیؔ مبتلا
دخل ہم کو بھی مزاجِ صاحبِ محفل میں ہے

○

غم درد کا باعث بھی، غم درد کا مرہم بھی
نسبت ہے جنھیں غم سے رہتے ہیں وہ بے غم بھی

سچ ہے کہ مسرت سے پیچھے نہ رہا غم بھی
آرائشِ گلشن میں کام آئی ہے شبنم بھی

اب ساتھ نہیں دیتا واللہ ترا غم بھی
زخمِ غمِ دوراں سے عاجز ہے یہ مرہم بھی

راس آنے نہ آنے پر موقوف ہے بس ورنہ
ہے اپنی جگہ دنیا جنت بھی جہنم بھی

انساں کے سمجھنے کی توفیق پہ مبنی ہے
فطرت کے اشارے تو واضح بھی ہیں مبہم بھی

اک عمر گزاری ہے تب جا کے یہ سمجھے ہیں
سب ایک ہی جیسے ہیں اغیار بھی محرم بھی

تھا درد بھرا اتنا افسانۂ غم اپنا
کچھ سن نہ سکے وہ بھی کچھ کہہ نہ سکے ہم بھی

دانا کہ مشیت تھی یہ کارگہِ ہستی
کام آ کے رہی لیکن اک لغزشِ آدم بھی

تقدیر کے بل سیفی شاید ہی نکل پائیں
ہیں گیسوئے دوراں میں کچھ پیچ بھی کچھ خم بھی

○

یارانِ میکدہ مجھے مت بھول جائیو
تم سے اگر بچے تو مجھے بھی پلائیو

شاید کبھی سمجھیں کبھی پڑے غم سے واسطہ
لوگو کسی کے غم کی ہنسی مت اڑائیو

دنیا کو احتیاط سے کوئی غرض نہیں
گر ہو سکے تو مجھ سے بھی دامن بچائیو

گزری ہوئی حیات کے اے تلخ واقعات
احساس مار دے گا سمجھ میں نہ آئیو

کچھ ایسے حادثات گزرتے ہیں عشق میں
اتنے ہی یاد آئینگے جتنا بھلائیو

تم نے اسے کنوئیں میں گرایا کیا ہوا
یوسف ابھی حیات ہے یوسف کے بھائیو

ہر گز اکائیوں کو سمجھیو نہ تم حقیر
موجود سیکڑے بھی تو ہیں ایک رائیو

مانا کہ سخت ہے روشِ عام سے گریز
پھر بھی حیات کے نئے رستے بنائیو

کرنی ہے بے وفائی تو کیجیو کچھ اسطرح
یادوں میں بھی ہزار میں چاہوں نہ آئیو

آنکھوں کی یہ اداسیاں ذہنوں کی یہ تھکن
اللہ غم پہ غم نہ کسی کو دکھائیو

شاید کہ ہو عزیز اداسی بھی متاعِ غم
سیفی بہت ہی سوچ کے آنسو بہائیو

○

غم کا ماحول کب بدلتا ہے
رات ہوتی ہے دن نکلتا ہے

روز اک تازہ غم۔ معاذ اللہ!
دل بھی کس بات سے بہلتا ہے

ظلمتیں ہیں کہ کم نہیں ہوتیں
آشیاں ہے کہ روز جلتا ہے

بے کسی بھی عجیب لعنت ہے
اپنا سایہ نہ بچ کے چلتا ہے

ساتھ دیتے نہیں چمن والے
جب ہواؤں کا رخ بدلتا ہے

قیدِ ہستی ہے جبر کی زنجیر
اس کا لوہا کہاں پگھلتا ہے

عمر بھر کرب میں گزرتی ہے
تب کہیں جا کے دم نکلتا ہے

میری بالیں پہ آ کے بتلا دو
موت کا وقت کیسے ٹلتا ہے

شرط ہے صرف زندگی کا شعور
آندھیوں میں چراغ جلتا ہے

میرے آنسو ہیں ان کی آنکھوں میں
کارواں راستہ بدلتا ہے

کاروانِ حیات اے سیفی
موت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے

تذکرہ چھیڑ دو نہ ایسے میکدوں کا دوستو
ٹوٹ جائے جس سے دل ہم میکشوں کا دوستو

عادتیں میری وفا کیشی و ایثار و خلوص
ہوں فقط مارا ہوا ان عادتوں کا دوستو

کھُل کے میرے سامنے آئے جو ہر ہر موڑ پر
میں بہت ممنون ہوں اُن دشمنوں کا دوستو

ہو گیا غم آشنا کیوں اس قدر میرا مزاج
رنگ دیکھا ہے تمہارے تیوروں کا دوستو

اُف رے غم احساسِ غم احساسِ غم کی شدتیں
میری رگ رگ میں رچاؤ ہے غموں کا دوستو

تم کو ہونا ہی پڑے شاید مرا احسان مند
جائزہ لے لو اگر اپنے دلوں کا دوستو

○

مری ہنسی کو مآلِ شگفتگی نہ کہو
کہو یہ بات مگر اس طرح کبھی نہ کہو

ہنسا جو ہوں تو سمجھ لو کہ دل میں درد بھی ہے
مری خوشی کو خوشی جان کر خوشی نہ کہو

ہے عرضِ حال تقاضائے فطرتِ انساں
بیانِ درد کو توہینِ عاشقی نہ کہو

گذار دی ہے تمھاری گلی میں عمرِ عزیز
خدا کے واسطے اب مجھ کو اجنبی نہ کہو

ہے آدمی کے لئے شرط آدمیت بھی
ہر ایک شخص کو دنیا میں آدمی نہ کہو

○

نہ کوئی بزم، نہ بستی، نہ گلستان نکلا
دل سمجھتے تھے جسے ایک بیاباں نکلا

جس اندھیرے پہ تھا الزام سیہ بختی کا
وہ اندھیرا ہی اُجالوں کا نگہباں نکلا

جس سے اپنوں کا کرم صاف نظر آتا تھا
دل کے زخموں میں وہی زخم نمایاں نکلا

میرے ہر اشک میں تھی کرب کی دنیا آباد
یہ تو ہر قطرہ ہی اپنی جگہ طوفاں نکلا

غم، تڑپ، درد، کسک، زخم اور آنسو سلمیٰ
میرے جینے کے لئے صرف یہ ساماں نکلا

○

ہم لاکھ سر بلند ہوں مینار کی طرح
جھکنا پڑے گا شاخِ ثمر دار کی طرح

تھا وقت کا یہ فیصلہ اپنی جگہ غلط
ہم گر پڑیں گے ریت کی دیوار کی طرح

آساں نہیں ہے منزلِ عرفان و آگہی
بکنا پڑے ہے یوسفِ بازار کی طرح

دیکھو مری نظر سے تو شاید سمجھ سکو
ہر شے ہے کیوں حسین رخِ یار کی طرح

ان میں مرے نصیب کی تاریکیاں بھی ہیں
گیسو نہ تھے سیاہ شبِ تار کی طرح

اس کے وجود کے لئے کیا حاجتِ دلیل
موجود ہو جو نقطۂ پرکار کی طرح

لہجے کی نرمیوں کا بھی سیفی رہے خیال
لفظوں میں کاٹ ہوتی ہے تلوار کی طرح

○

سودائی کہے ہے کوئی دیوانہ کہے ہے
اس حال میں دنیا مجھے کیا کیا نہ کہے ہے

غم اُن کی عنایت ہے تو کیوں غم کو نہ چاہیں
اپنوں کو بھلا کوئی کبھی بیگانہ کہے ہے

اس دور میں ہر بات کا امکان ہے یارو
دیوانہ کبھی دیوانے کو دیوانہ کہے ہے

سرخی مری رودادِ الم کی ہے لہو رنگ
افسانے کا عنوان ہی افسانہ کہے ہے

"منصور" لقب ہو کہ مرا نام ہو "سرمد"
دنیا مجھے ہر دور میں دیوانہ کہے ہے

ہر دور میں تجدید وفا ہوتی ہے سیفی
ہر دور کا منصور یہ افسانہ کہے ہے

○

نام دنیا میں کر گئے ہوتے
نام پر اُن کے مر گئے ہوتے

ہم اگر راہ پر گئے ہوتے
ہم تمہارے نگر گئے ہوتے

طعنہ زن ہیں جو مری وحشت پر
وہ اگر در بدر گئے ہوتے

ہجر اور وصل اعتباری ہیں
اِن حدوں سے گزر گئے ہوتے

آگہی سے ہیں دوزخ و جنّت
دہر سے بے خبر گئے ہوتے

میرے سر آ گئے ہیں جو الزام
یہ اگر اُن کے سر گئے ہوتے؟

میں نہ برتوں جو احتیاط کہیں
لاکھ فتنے ابھر گئے ہوتے

اور بڑھتا ترا تغافلِ ناز
اور کچھ ہم سنور گئے ہوتے

غم نوازی نے آبرو رکھ لی
ورنہ بے موت مر گئے ہوتے

اُن کے دامن کا بھی تقاضا تھا
میرے آنسو بکھر گئے ہوتے

جو بنامِ خلوص کھائے تھے
کاش وہ زخم بھر گئے ہوتے

اِن اندھیروں کی لاج رہ جاتی
اِن اندھیروں سے ڈر گئے ہوتے

حسن ہی حسن تھا جدھر سیفی
کاش ہم بھی اُدھر گئے ہوتے

○

کیا دنیا سے اٹھ ہی چکے ہیں سب جانے پہچانے لوگ
جس بستی میں جا کر دیکھو ملتے ہیں انجانے لوگ

یہ تو خبر ہے اب آئیں گے قبر میں کچھ انجانے لوگ
تنہا کیوں چھوڑے جاتے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

دل والوں کو کب یہ دنیا چین سے رہنے دیتی ہے
بیٹھے بٹھائے گھیر لیتے ہیں جانے کیوں افسانے لوگ

دار و رسن کی لاج انھیں کے دم سے کچھ رہ جاتی ہے
جن لوگوں کو دنیا والے کہتے ہیں دیوانے لوگ

دیوانہ تو دیوانہ ہے دیوانے کی بات ہی کیا
دیوانے ہیں دیوانے کو آئے جو سمجھانے لوگ

آؤ سیفی پیر مغاں کی محفل میں ہو آئیں، آج
سنتے ہیں اُس محفل میں ہیں سب اپنے بیگانے لوگ

○

راہوں سے تری گزر رہا ہوں
مشکل ہے جو کام کر رہا ہوں

جو چھوڑ گئے ہیں ساتھ میرا
ایسوں کا بھی ہم سفر رہا ہوں

تسلیم حیات کا تقاضا!
جی لوں گا، ابھی تو مر رہا ہوں

اپنوں سے ہوں اس طرح گریزاں
جیسے کسی شے سے ڈر رہا ہوں

کرب غم زیست اُف خدایا
تلوار کی دھار پر رہا ہوں

بے رنگ کتاب زندگی میں
رنگ اپنے لہو سے بھر رہا ہوں

پھیلا کے لہو کی سرخیوں کو
تزئینِ حیات کر رہا ہوں

تب جا کے ہوئی ہے باریابی
برسوں میں اِدھر اُدھر رہا ہوں

یادوں میں کسی کی میرا رہنا
ممکن تو نہ تھا مگر رہا ہوں

مجبوریٔ مصلحت، نہ پوچھو
اُن سے بھی گریز کر رہا ہوں

یزداں بھی تھا ساتھ اہرمن بھی
میں مرکزِ خیر و شر رہا ہوں

دشواریاں آگہی سے بڑھتیں
اچھا ہے کہ بے خبر رہا ہوں

اس ڈھنگ سے جی رہا ہوں سیفی
جیسے کوئی جرم کر رہا ہوں

اسباب وفا کی گرمیِ بازار کم نہیں
منصور آج بھی تو سرِ دار کم نہیں

غم ہائے زندگی بھی نہ کیوں ہوں مجھے عزیز
غم ہائے زندگی میں کبھی آزار کم نہیں

ان کا خیال، انکا تصور، انہیں کی یاد
اپنی تباہیوں کے یہ آثار کم نہیں

رفتار کے لئے کمی بیشی ضرور ہے
لیکن یہ کیا کہ وقت کی رفتار کم نہیں

محتاج ہر محیط ہے اس کے وجود کا
مبہم سہی یہ نقطۂ پرکار کم نہیں

ضعیفی کے سلسلے میں ہے احباب کی یہ رائے
انسان کم ضرور ہے فنکار کم نہیں

کیا ستم ہے، جن راہوں نے منزل تک پہنچایا ہے
ان راہوں پر چلنے والا دیوانہ کہلایا ہے

ان کے غم نے آہیں بخشیں، درد عطا فرمایا ہے
مجھ کو تہی دامن مت سمجھو، یہ تو بڑا سرمایا ہے

سخت کٹھن تھیں زیست کی راہیں وہ تو کہیئے خیر ہوئی
ان کی زلفوں کی خوشبو نے ہر کوچہ مہکایا ہے

ہم نے تو بس عشق کیا تھا، فکرِ مآل کار نہ تھی
اب اس کا رونا ہی کیا ہے کیا کھویا کیا پایا ہے

اب تک اپنا ساتھ نہ چھوڑا، ماضی کے اندھیاروں نے
آگے آگے ہم چلتے رہیں پیچھے پیچھے سایا ہے

ایسی گھڑیاں بھی آئی تھیں جن کو رو کر کاٹ دیا
لیکن وہ لمحات کہ جب رو لے تو رونے بھی گھبرایا ہے

جن کی نظر میں قدر نہیں کچھ سلیقی غم کے مارو نکی
ان کو دل کی بات بتا دی کیسا دھوکہ کھایا ہے

○

سلسلہ اب لبِ اظہار تک آ پہنچا ہے
خونِ دل نکتۂ اشعار تک آ پہنچا ہے

اُس پہ دنیا نے لگایا ہے جنوں کا الزام
جو شعورِ رسن و دار تک آ پہنچا ہے

سوزِ غم کی بھی رسائی ہے کہاں تک یارب
اشک بن کر مژۂ یار تک آ پہنچا ہے

دل کو جینے کا سلیقہ تو میسّر آیا
آپ کے درد کے معیار تک آ پہنچا ہے

بانکپن اب مرے شعروں میں کہاں پہلا سا
غم کا سایہ مرے افکار تک آ پہنچا ہے

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سیفیؔ غمِ دنیا سے پناہ
آپ کے سایۂ دیوار تک آ پہنچا ہے

○

لاکھ ملے غم منزل منزل پھر بھی نہیں گھبرائے ہم
اے غمِ جاناں تیرے سہارے دنیا سے ٹکرائے ہم

ہم سے پوچھو کیا ہے محبت، آؤ سمجھائیں ہم
پہلے سب گھر بار لٹایا تب اُنکے کہلائے ہم

سادہ مزاجی شیوہ اپنا، ہم کیا جانیں لاگ لپیٹ
جب دیکھا ماحول غلط ہے محفل سے اُٹھ آئے ہم

دنیا والے ہم پہ ہنسے جب ہم نے اپنا درد کہا
دل کی بات زباں پر لاکر پہروں تک پچھتائے ہم

ضبط کی خودداری کو سیفی ٹھیس نہ کیا کیا پہنچی گی
کہتے کہتے اپنی کہانی، اشک اگر بھر لائے ہم

ان کے غم سے رشتہ جوڑیں یادوں کو مہمان کریں
بیگانوں کی اس دنیا میں جینے کا سامان کریں

اس نے چھوڑا دھیان ہمارا ہم کیوں اس کا دھیان کریں
بیٹھے بٹھائے کیوں اے لوگو! اپنا جی ہلکان کریں

ہم ٹھیرائیں اپنا مسلک "حسرتِ جلوہ" ذوقِ نظر"
اور فرازِ طور پہ جا کر مسلک کا اعلان کریں

دل کے ساتھ تری راہوں میں دین گیا ایمان گیا
لے دیکھے اک جان بچی ہے یہ بھی نہ کیوں قربان کریں

شاید ایسے ہی یہ دنیا ہم سے راضی ہو جائے
ہم خود اپنے ہاتھوں اپنے مرنے کا سامان کریں

دل جیسا ساتھی بھی سیفی اوروں کا دم بھرتا ہے
کس کو دوست بنائیں آخر کس کا اطمینان کریں

ترا غم عطا ہوا ہے مجھے دو جہاں سے پہلے
کوئی داستاں نہیں تھی مری داستاں سے پہلے

ترے سنگِ در نے بخشا ہے شعورِ سجدہ ریزی
نہ جبینِ شوق کیا تھی ترے آستاں سے پہلے

مری غم نوازیاں ہی مرے کام آنہ جائیں
انھیں سوچنا پڑے گا مرے امتحاں سے پہلے

مرے ساتھ اہلِ گلشن کبھی سزا بھگت رہے ہیں
نہ تھا خوف بجلیوں کا مرے آشیاں سے پہلے

مرا لفظ لفظ سیفی مرے غم کا ترجماں ہے
یہ فسانہ ایک سا ہے وہ سنیں جہاں سے پہلے

○

مجھے تیرے غم سے بڑھ کر کوئی اور غم نہ ہوگا
جو عطا کیا ہے تو نے وہ سرور کم نہ ہوگا

رگ و پے میں رچ گیا ہے ترا غم حیات بن کر
مجھے اب خوشی نہ دینا یہ کرم کرم نہ ہوگا

ہے نگاہِ اہلِ دل میں مری قدر تیرے غم سے
ترا غم اگر نہ ہوگا تو مرا بھرم نہ ہوگا

نہ ملے گی میرے سجدوں کو سند قبولیت کی
جو سرِ نیاز میرا ترے در پہ خم نہ ہوگا

مری زندگی کا ماتم تو کرے گا اک زمانہ
مرے بعد اور کوئی جو حریفِ غم نہ ہوگا

مجھے بار بار سیفی یہی تجربہ ہوا ہے
جو شریکِ عیش ہوگا وہ شریکِ غم نہ ہوگا

○

غم نصیب لمحوں سے دوستی ضروری ہے
زندگی تجھی ظلمت میں روشنی ضروری ہے

ہر اصول فطرت کی پیروی ضروری ہے
کل بھی یہ ضروری تھا آج بھی ضروری ہے

ظالمو تمہارا کیا شکوہ ظلمتیں تو دولت ہیں
روشنی کے پلنے کو تیرگی ضروری ہے

سرکشی بری شے ہے۔ یہ درست ہے لیکن
اہلِ کبر و نخوت سے سرکشی ضروری ہے

اہلِ عقل و اہلِ دل، طے نہ کر سکے اب تک
بے خودی ضروری ہے یا خودی ضروری ہے؟

ہے دروغ گوئی بھی مصلحت سے وابستہ
یہ کبھی ہے ناجائز اور کبھی ضروری ہے

○

راس کس انداز سے آئی ہے رسوائی مجھے
اک زمانہ کہہ رہا ہے انکا سودائی مجھے

میرے سجدوں نے نہ جانے سنگ در سے کیا کہا
آستاں دینے لگا دادِ جبیں سائی مجھے

میری وحشت کو شعورِ دشت پیمائی نہ تھا
دشت میں لایا ہے ذوقِ آبلہ پائی مجھے

ہر برائی میں بھلائی کا بھی اک انداز ہے
ان کی یادیں دے گئی ہے شامِ تنہائی مجھے

رو رہا ہوں میں تو تسنیمی ہنسی ہے ہونٹ پر
رو پڑے گا یہ زمانہ گر ہنسی آئی مجھے

کس جرم کی یاروں نے مجھ کو یہ سزا دی ہے
مرنے کی دعا دیتے جلنے کی دعا دی ہے

چلمن جو اٹھا دی تھی چلمن جو گرا دی ہے
اک آگ بجھا دی تھی اک آگ لگا دی ہے

آزار رسیدی کا دل آج کبھی عادی ہے
ہر ظلم کے بدلے میں ظالم کو دعا دی ہے

اشکوں کا تو منصب تھا شعلوں کو بجھا دینا
لیکن مرے اشکوں نے شعلوں کو ہوا دی ہے

پھولوں کو مہکنے کے آداب نہ آتے تھے
خوشبو تری زلفوں کی پھولوں میں بسا دی ہے

یہ دار و رسن کیا تھے بے روح سی دو لفظیں
منصور کے قدموں نے تو قیر بڑھا دی ہے

آئے تھے دمِ آخر دامن کی ہوا دینے
دامن کی ہوا دی ہے یا شمع بجھا دی ہے

حالات مرے سیفی اک طنز سہی لیکن
اس طنزِ مسلسل نے جینے کی ادا دی ہے

○

یہ تیرگی ہی بھلی ہے جو تا حیات چلے
تمام عمر ترے کیسوؤں کی رات چلے

خرد کی راہ پہ جب ہم جنوں صفات چلے
ہمارے ساتھ زمانے کے حادثات چلے

کسی کی لاج رہے یا کھُلے کسی کا بھرم
وفا کی بات چلی ہے تو پھر یہ بات چلے

جلاؤ شمع محبت جلاؤ شمع وفا
نہ جانے اور کہاں تک یہ غم کی رات چلے

لگے نہ ٹھیس کہیں دل کے آبگینوں کو
تمھاری بزم میں ایسی کوئی بات چلے

ملا جو نورِ یقیں تیرگی کے ماروں کو
لئے نظر میں شعورِ تجلیات چلے

کسے یقین کہ پائے گا منزلِ جاناں
وہ قافلہ بھی جو تا حدِ ممکنات چلے

ہے ذکرِ گیسوئے جاناں غمِ جہاں کا علاج
چلے یہ ذکرِ حسیں اور تمام رات چلے

چلے جدھر کو بھی شائستگانِ غمِ سفیؔ
دلوں میں اپنے لئے دردِ کائنات چلے

○

اک عمر تری یاد میں یوں محو رہا ہوں
سانچے میں اداؤں کے تری ڈھل سا گیا ہوں

مجھ کو تری تصویر سمجھتا ہے زمانہ
کیا میں ترا انداز ہوں کیا تیری ادا ہوں

حالات کا شکوہ تو زباں پر نہیں لیکن
گزری ہے کچھ ایسی نہ جیا ہوں نہ مرا ہوں

بیگانوں کی دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا
لگتا ہے کہ جیسے کسی صحرا میں کھڑا ہوں

سوتوں کو جگاتی ہے مری آہِ سحر خیز
میں بانگِ درا بانگِ درا بانگِ درا ہوں

ہر گام زمانے کو رہی میری ضرورت
جو مٹ نہیں سکتا کبھی وہ نقشِ وفا ہوں

وہ گرمیٔ افکار سبھی کا ہو مقدر
جس گرمیٔ افکار سے میں شعلہ نوا ہوں

ظلمت ہوں مگر ہوں ترے پرتو سے منوّر
تو حسن ہے میں تیری تجلی کی ضیا ہوں

الفاظ مرے کیوں نہ ہوں اب حاصلِ دنیا
میں اپنی جگہ درد بھرے دل کی صدا ہوں

افکار کو میرے کوئی سمجھے تو یہ جانے
نفرت کی نہیں صرف محبت کی صدا ہوں

ہے کس کی کشش، اٹھتی ہیں کیوں میری نگاہیں
یہ کون ہے میں کس کی طرف دیکھ رہا ہوں

وہ ترکِ وفا کر گئے رستی مگر اب میں
تنہائی میں بیٹھا ہوا کیا سوچ رہا ہوں

○

غم سے وابستگی تھی بہت دن ہوئے
زندگی زندگی تھی بہت دن ہوئے

بات ناگفتنی تھی بہت دن ہوئے
جان پر بن گئی تھی بہت دن ہوئے

اٹھ رہا ہے نشیمن سے اتنک دھواں
ایک بجلی گری تھی بہت دن ہوئے

زندگی کے سہاروں کی فہرست میں
آپ کی یاد بھی تھی بہت دن ہوئے

عرضِ غم کی شکایت ہے انتک انھیں
اک غزل ہو گئی تھی بہت دن ہوئے

ان کی خاطر ہم جینے کی راہ نکالے جائینگے
ہم سے جبتک ممکن ہوگا موت کو ٹالے جائینگے

دل کا بوجھ تو ہلکا ہوگا اے آنکھو کچھ رو لینا
اشکوں کے طوفان اٹھے تو غم کو بہالے جائینگے

پانی جیسے اشکوں سے رونا بھی کوئی رونا ہے
جبتک دل کا خون نہ ہوگا اشک نہ ڈھالے جائینگے

ہم کو جنون عہد وفا ہے لاکھ ہمیں تم دھتکارو
ہم تو مرتے دم تک اپنی بات کو پالے جائینگے

ہٹ دھرمی سے بے دھرمی تک پہنچ نہ جائے دھرم کی بات
آج کے راون آجکی سیتاؤں کو اٹھالے جائینگے

جن رندوں سے میخانے کے نام کو بٹہ لگتا ہے
اُن رندوں تک آخر اک دن زہر کے پیالے جائینگے

رندو! واعظ کے چھوتے ہی جام و سبو ناپاک ہوئے
پاک نہ ہونگے جبتک کوثر سے نہ دھنگائے جائینگے

جاں بازی کا وقت اگر آیا تو دنیا دیکھے گی
دار و رسن کی جانب سیفی ہم دل والے جائینگے

○

شاید نگاہ ساقی اک بار اٹھ گئی ہے
رہ رہ کے میکدے میں بجلی سی کوندتی ہے

ویسی ہی بے خودی ہے، ویسی ہی خامشی ہے
وہ جا چکے ہیں لیکن عالم ابھی وہی ہے

میری ہی داستاں تھی ہر اک کی زباں پر
محفل میں میں نے یوں بھی روداد غم کہی ہے

محفل پہ منحصر کیا سنکر مرا فسانہ
انکی بھی نیند اکثر راتوں کو اڑ گئی ہے

خونِ حسین ہے پھر، درکار عصر نو کو
رفتارِ نبضِ عالم پھر سست ہو گئی ہے

ہجر و وصال دونوں لذت فزا ہیں سیفی
اک یاد آرہی ہے اک یاد جارہی ہے

○

دشوار ہے نباہ غمِ زندگی کے ساتھ
کیسے گزار دیگا کوئی اجنبی کے ساتھ

اپنے گزر گئے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ
سچ ہے کسی کو ربط نہیں ہے کسی کے ساتھ

ان کا کبھی نام میرے فسانے میں آئے گا
ان کو بھی ربط ہے مری دلیوانگی کے ساتھ

اے ساکنانِ شہرِ نگاراں یہ سوچیئے
کچھ تو خلوص چاہیئے اک اجنبی کے ساتھ

تھا اُنکی بزمِ ناز کا شاید کچھ احترام
گزری ہیں وحشتیں بھی تو شائستگی کیساتھ

سیفی غمِ حیات نے دی ہیں جو تلخیاں
ہنس ہنس کے ~~کھیل~~ ہیں مری شاعری کیساتھ

○

متاعِ ہوش لٹ کر رہ گئی اے دل تو کیا ہوگا
چلے آئے وہ بے پردہ سرِ محفل تو کیا ہوگا

دلِ درد آشنا دولت سہی، نعمت سہی لیکن
نہ پہچانا جو دنیا نے مقامِ دل تو کیا ہوگا

یہ اندیشہ مجھے لب کھولنے سے باز رکھتا ہے
نہ لائی تابِ عرضِ غم اگر محفل تو کیا ہوگا

مرا افسانۂ غم ہی رلا دیتا ہے محفل کو
ترے آنسو بھی اس میں ہو گئے شامل تو کیا ہوگا

جو موجیں زندگی دیتی ہیں طوفان و تلاطم کو
وہ موجیں ہو گئیں آسودۂ ساحل تو کیا ہوگا

جو اپنے حال سے غافل ہیں مستقبل کی فکروں میں
نہ راس آئی انھیں یہ فکرِ مستقبل تو کیا ہو گا

برائے مقصدِ منزل غلط راہوں پہ مت دوڑو
اگر ثابت ہوئی یہ سعئ لاحاصل تو کیا ہو گا

مجھے جنت سے رخصت کرنے والے یہ بھی سوچا تھا
اسے راس آ گئی دنیائے آب و گل تو کیا ہو گا

دلِ سیفی کا نازک آبگینہ توڑنے والے
اگر ٹوٹا کبھی ایسے ہی تیرا دل تو کیا ہو گا

○

تیرے دلوانے سوئے دار اگر جاتے ہیں
ان کی وحشت کے سب انداز نکھر جاتے ہیں

تیرے گیسو جو سرِ دوش بکھر جاتے ہیں
میرے بگڑے ہوئے حالات سنور جاتے ہیں

چارہ گر رکھتے ہیں مرہم بھی تو بڑھتے ہیں یہ زخم
تم چھڑکتے ہو نمک تب تو یہ بھر جاتے ہیں

رات کٹ جاتی ہے تاروں کی بدولت لیکن
صبح ہوتے ہی یہ کمبخت بھی مر جاتے ہیں

کم شناسی کی شکایت نہیں شیدہ اپنا
لے! تری بزم سے ہم اہلِ نظر جاتے ہیں

جانے کیا ایسی کشش ہے تری محفل میں کہ ہم
لاکھ کہتے ہیں نہ جائیں گے مگر جاتے ہیں

صرف نظروں کو نہ الزامِ نظارہ دیجئے
جلوے خود بھی تو سرِ بام بکھر جاتے ہیں

اشک ریزی سے مجھے روکنے والے یہ نہ جا
کیوں چھلک پڑتے ہیں وہ جام جو بھر جاتے ہیں

سرفروشوں کا جو ہوتا ہے شمار اے سیفی
چند سر ہیں جو سرِ دار اُبھر جاتے ہیں

○

کیوں مجھ پہ تنگ صحنِ گلستاں ہے دوستو
یہ تو خلافِ فطرتِ یاراں ہے دوستو

تنکے سمجھ رہے ہو جسے اپنی بھول سے
وہ آشیاں متاعِ گلستاں ہے دوستو

کھائے ہزار زخم مگر سب بھلا دیئے
زخمِ خلوص ہے کہ نمایاں ہے دوستو

اب سیرِ گلستاں کا تقاضہ فضول ہے
تازہ ابھی تو زخمِ بہاراں ہے دوستو

بیداریٔ شعور ضروری ہے آج بھی
برہم مزاجِ گردشِ دوراں ہے دوستو

ستیفی کا نام سُن کے یہ انداز برہمی
ستیفی تو جانِ محفلِ رنداں ہے دوستو

○

ہم اہلِ عزم و عمل وہم کے اندھیروں میں
لہو سے اپنے چراغِ یقیں جلا کے چلے

ہماری راہ پہ چلنا کوئی مذاق نہیں
کہ سوئے دار بھی ہم لوگ مسکرا کے چلے

یہ کاروانِ جنوں ہے کہیں نہ ٹھہرے گا
چلے جو ساتھ ہمارے قدم بڑھا کے چلے

فضا چمن کی رہی جب نہ سازگار ہمیں
خود اپنے ہاتھ سے ہم آشیاں جلا کے چلے

چمن چمن نہ رہا آشیاں کا ذکر ہی کیا
ہوائے وقت کے جھونکے بھی کس بلا کے چلے

جو رہ نہ سکتے تھے میرے بغیر اے سیفی
وہ آج مجھ سے نگاہیں بچا بچا کے چلے

○

آنسو وہی آنسو ہے جو مژگاں سے نہ ڈھل کے
دامن کے لئے آنکھ میں رہ جائے مچل کے

اس بات کو اب لوں کہو عنوان بدل کے
اُس شوخ کے ابرو نہیں مطلعے ہیں غزل کے

انکا سا خرام سبک انداز کہاں ہے
چاہے تو نسیم سحری دیکھ لے چل کے

رندوں کو ملی سلطنتِ ساغر و مینا
زاہد ابھی جھگڑے میں ہے ایمان و عمل کے

رفتار ہے منجملۂ آثارِ قیامت
گفتار کے انداز میں بیتور ہیں غزل کے

یہ دل کے قریب آ کے مجھے کس نے صدا دی
کیا تم نے پکارا مجھے آواز بدل کے

ہے تابِ تجلی تو نگاہوں کو ہے سیفی
وہ طور تھا جو رہ گیا اس آگ میں جل کے

○

اندھیرا ہو نہیں سکتا کبھی اپنے نشیمن میں
ستارے پرورش پاتے ہیں میری چشمِ گریاں میں

مرا حق بھی کسی سے کم نہیں فصلِ بہاراں پر
لہو میرا بھی کام آیا ہے تعمیرِ گلستاں میں

ابھی اے دستِ وحشت اور کچھ زحمت گوارا کر
ابھی کچھ تار باقی اور ہیں میرے گریباں میں

لبِ ساحل کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے والو!
چلے آؤ حیاتِ جاوداں ہے موجِ طوفاں میں

وفاؤں کے کچھ ایسے نقش ہم بھی چھوڑ آئے ہیں
ہمارا ذکر بھی آئے گا اکثر بزمِ جاناں میں

زمانہ میرے بدلے آج ان سے کیوں اُلجھ بیٹھا
مرے دامن کے ٹکڑے تو نہیں انکے گریباں میں

یہ اکثر چھیڑتا ہے کون سازِ زندگی سیفی
کہ نغمے جاگ اُٹھتے ہیں مرے تارِ رگ جاں میں

ہر غم کا اثر یارو لوحِ ذہن سے دھو دینا
احساس کی شدت کو ساغر میں ڈبو دینا

غم نے ترے ہنسنے کی توفیق عطا کی ہے
دنیا نے سکھایا تھا حالات پہ رو دینا

یہ کہہ ہی دیا آخر مردانِ شناور نے
موجوں کو نہیں آتا کشتی کو ڈبو دینا

حالات کچھ ایسے بھی گزرے ہیں کبھی جن میں
ممکن نہ تھا ہنس لینا، آساں نہ تھا رو دینا

کیا جانئے کیا جادو اشکوں نے کیا سیفی
آسان نہ تھا ان کے دامن کو بھگو دینا

عرضِ غم رائگاں ہو نہ جائے
وہ شریکِ فغاں ہو نہ جائے

جس فسانے میں ہے ذکر اُن کا
بے خودی میں بیاں ہو نہ جائے

لذتِ ہجر کی خیر یارب
وہ کہیں مہرباں ہو نہ جائے

اے صبا اس طرح عرض کرنا
بات ان کو گراں ہو نہ جائے

اٹھ گئی ہیں نگاہیں اچانک
حادثہ ناگہاں ہو نہ جائے

میری بربادیوں کا فسانہ
آپ کی داستاں ہو نہ جائے

رہبروں کے کرم کی بدولت
گم نہیں کارواں ہو نہ جائے

سوچتا ہوں مری آزمائش
آپ کا امتحاں ہو نہ جائے

آنکھ نم ہو تو ڈر ہے یہ سیفی
رازِ الفت عیاں ہو نہ جائے

○

کون آتا ہے عیادت کو سحر ہونے تک
کوئی تدبیر تو ہو رات بسر ہونے تک

چھوڑنا ہم کو پڑے گا ترا کوچہ ترا در
ہم نے سوچا بھی نہ تھا شہر بدر ہونے تک

رفتہ رفتہ ہوا تبدیل چمن زاروں میں
دل کا ویرانہ تری راہ گذر ہونے تک

پردۂ ظلمتِ شب میں یونہی مستور رہیں
روئے خورشید نکھرتا ہے سحر ہونے تک

ایک موہوم تجلی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جلوہ جلوہ ہوا شایانِ نظر ہونے تک

عقل کے بس کا نہیں ہے کہ یہ نکتہ سمجھے
کیا گزرتی ہے رسولوں پہ بشر ہونے تک

کیا خبر کتنے مراحل سے گزرنا ہوگا
قطرۂ اشک کو تابندہ گہر ہونے تک

سہتا رہتا ہے یہ ہر لمحہ عذاب تخلیق
حسنِ نوخیز کی غنچہ۔ گل تر ہونے تک

رہ نوردانِ محبت پہ کٹھن گزرے گی
دشتِ تنہائی میں سیفی مرا گھر ہونے تک

یہ بجا کہ میری آہیں ابھی دور ہیں اثر سے
نہ سہی ہیں کچھ بھی لیکن نہ گرائیے نظر سے

مجھے زہرِ غم کی تلخی بھی مٹھاس دے رہی ہے
کہ پلی ہے یہ بھی مجھ کو تری مدھ بھری نظر سے

جو بھگو گئے ہوں دامن انھیں اشک ہی نہ سمجھو
وہی اصل میں ہیں آنسو نہ بہیں جو چشمِ تر سے

مرے بعد آنیوالو مری پیروی نہ کرنا
نہ گذر سکے گا شاید کوئی تنکا رواں ادھر سے

غمِ زندگی جو آئے تو بہ احتیاط گزرے
ترا غم گزر رہا ہے مرے دل کی رہ گذر سے

انھیں خود ہی قدر ہوگی مرے آنسوؤں کی سیفی
اگر اپنا جائزہ لیں وہ کبھی مری نظر سے

○

اے رونقِ حیات مرا دم ہے اور تو
میں اعتبارِ شام و سحر ہوں مجھے نہ چھیڑ

میں بجھ گیا تو قہر ہے اے صرصرِ حیات
میں تو چراغِ راہ گزر ہوں مجھے نہ چھیڑ

پس ماندہ تو ضرور ہوں اے گردِ کارواں
لیکن ترا شریکِ سفر ہوں مجھے نہ چھیڑ

ہاں اے ہوائے کوچۂ جاناں ادھر نہ آ
میں آجکل تو شہر بدر ہوں مجھے نہ چھیڑ

دامن بچا کے مجھ سے گزر اے رئیسِ شہر
گردِ و غبارِ راہ گزر ہوں مجھے نہ چھیڑ

جبتک بشر ہوں خیر ہوں اے زعم شیطنت
بارہ ہو گئی الگ تو میں شر ہوں مجھے نہ چھیڑ

دنیا ترے فریب کی قیمت ہی کیا کہ میں
پروردۂ فریبِ نظر ہوں مجھے نہ چھیڑ

روشن ہوں اپنے نور سے اے ظلمتِ حیات
پروردگارِ شمس و قمر ہوں مجھے نہ چھیڑ

اے تلخ واقعات کی یادوں کے سلسلے
میں خود ہلاکِ فکر و نظر ہوں مجھے نہ چھیڑ

○

در میں آج یہ کمی کیسی
بات بن کر بگڑ گئی کیسی

ہجر کا غم وصال کی امید
زندگی میں ہے دلکشی کیسی

میرے پینے کا ڈھنگ ہے ورنہ
چشمِ ساقی سے مے کشی کیسی

اُن کی آنکھوں میں آ گئے آنسو
بات حد سے گزر گئی کیسی

مشورہ اُن سے ترکِ الفت کا
بات کرتے ہیں آپ بھی کیسی

چند پروانے جل گئے تھے مگر
شمع بدنام ہو گئی کیسی

میری قسمت کی الجھنیں ہونگی
اُن کی زلفوں میں برہمی کیسی

غم متاعِ حیات ہے ساقی
غم نہیں ہے تو زندگی کیسی

○

بزمِ دل اُن کے تصوّر سے سجائے رکھئے
کوئی ماحول تو جینے کا بنائے رکھئے

خود فریبی بھی ہے منجملۂ سامانِ حیات
آس اُن سے بھی وفاؤں کی لگائے رکھئے

آپ کے نام پہ مرتا ہوں تو دیوانہ ہوں
آپ تو میرے لئے ایسی نہ رائے رکھئے

کیجئے تشنگیٔ عشق کا احساس ابھی
اپنی نظریں مری نظروں سے ملائے رکھئے

زندگی سہل نہ ہو جائے تو میرا ذمہ
دل کے زخموں کو تبسم میں چھپائے رکھئے

آپ آرام جو چاہیں تو پھر اپنے دل میں
ان کا غم ان کے تصور کے بجائے رکھئے

غم دنیا نے پکارا ہے تو کہئے لبیک
ان کی یادوں کو سرِ دست بھلائے رکھئے

جن چراغوں سے ابلتا ہے اخلاص کا نور
اُن چراغوں کو بہر حال جلائے رکھئے

خودکشی کر کے گنہگار نہ بنئے سیفی
زیست اک بارِ امانت ہے اٹھائے رکھئے

ترے نثار جو گل جانِ انجمن ہوتے
انھیں گلوں کے فسانے چمن چمن ہوتے

تمہارا کوئی تبسم چرا لیا ہوگا
نہیں تو پھول کہیں ایسے خندہ زن ہوتے

ازل کے روز مقدّر رہی نہ خفی رسوائی
جو شیخ شیخ نہ ہوتے تو برہمن ہوتے

نہیں ہے حسن کی قدروں میں آج لیلائی
نہیں تو آج بھی کچھ قیس و کوہکن ہوتے

کرم نہ ہوتا جو احباب کا تو اے سیفی
وطن میں رہتے ہوئے ہم نہ بےوطن ہوتے

○

ضبطِ گریہ کے مراحل بھی ہیں دو بھر کتنے
پینے پڑتے ہیں ان آنکھوں کو سمندر کتنے

تو نے بخشا غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ جاں
زندگی تیرے بھی احسان ہیں مجھ پر کتنے

آج میں ایک نظر لے کے جو گھوما تو کھلا
آئینے کتنے ہیں اس شہر میں پتھر کتنے

جس تلاطم سے میں گزرا ہوں خدا جانتا ہے
ایسے طوفاں سے گزرتے ہیں شناور کتنے

میری نظروں سے مرے دل میں ذرا جھانک کے دیکھ
میرے آئینۂ ہستی میں ہیں جوہر کتنے

اُن کے گیسو فقط اک بار کھلے تھے ان پر
میرے شانے ہیں ابھی تک بھی معطّر کتنے

ان کی ایک ایک ادا جانِ سخن ٹھہری ہے
مل گئے ہیں مرے افکار کو تیور کتنے

آپ کے ایک تغافل کا بھرم کیا رکھّا
دیکھیے آ گئے الزام مرے سر کتنے

خوش نصیب اور بھی دنیا میں بہت ہیں لیکن
دیکھنا یہ ہے کہ ہیں میری برابر کتنے

○

نغمۂ عیش ہر اک حال میں گاتے رہیے
زندگی کے لئے ماحول بناتے رہیے

موم ہو سکتا ہے پتھر بھی یقیناً اک دن
داستانِ غمِ دل ان کو سناتے رہیے

ہو سکے اہلِ ہوس کا نہ گزر جن میں کبھی
بستیاں ایسی محبت کی بساتے رہیے

اہلِ دل ہونے کا ہر گام پہ یوں دیجے ثبوت
غم کے ماروں کو کلیجے سے لگاتے رہیے

مسئلہ بن نہ سکیں گے کبھی مستقبل و حال
یادِ ماضی کا ہر اک نقش مٹاتے رہیے

شیوۂ اہلِ محبت تو یہی ہے سیفی
یعنی غیروں کو بھی اپنا ہی بناتے رہیے

رفتار کو تو مل گیا بادِ صبا کا نام
تجویز کیا کریں ترے ناز و ادا کا نام

قیمت نہ لگ سکے گی کہ سادہ ہے یہ ورق
لکھ لیں بیاضِ دل پہ کسی دلربا کا نام

یا تو مری دعا کو اثر دے مرے خدا
یا یہ بتا کہ کیا رکھوں اپنی دعا کا نام

مجھ کو خبر نہ تھی کہ رکھا جائے گا "حیات"
اک دور میں مرے غمِ صبر آزما کا نام

اہلِ خرد کی بے خبری بھی عجیب ہے
دیوانگی رکھا ہے شعورِ وفا کا نام

ممکن ہے پھر یہ خاطرِ نازک پہ بار ہو
رکھ لیجئے کچھ اور مرے مدعا کا نام

انساں کی ناسپاسی کا عالم تو دیکھئے
مجبوریوں کو دیتا ہے شکرِ خدا کا نام

دل کائناتِ شوق ہے، دل کائناتِ غم
کیوں دیں نہ دل کو وسعتِ ارض و سما کا نام

ہر مرحلے پہ کام یہ کرتا ہے بے دریغ
کیا چیز ہے خدا کی قسم یہ خدا کا نام

سیفی کی یہ دعا ہے کہ میدانِ حشر میں
اس کا شفیع ہو شہِ ہر دوسرا کا نام

○

اپنے چہروں سے نقابوں کو اٹھا دو یارو
میرے ایثار کا کوئی تو صلہ دو یارو

اب بھی دنیا تمہیں ہمدرد سمجھتی ہے مرا
میری فطرت، مرے مشرب کو دعا دو یارو

میرے ہی چہرے کو پڑھ پڑھ کے نہ دو خود کو فریب
اپنے ذہنوں کو کبھی آئینہ دکھا دو یارو

زخم بخشے ہیں تو بے کیف نہ ہونے دو انہیں
نشترِ طنز بھی زخموں پہ لگا دو یارو

اپنی غیرت کے تقاضوں کی قسم کھاتا ہوں
نہ کہوں گا کہ مجھے دادِ وفا دو یارو

اپنے ذہنوں کو نہ ہونے دو تھکن کا احساس
اب مجھے پھر کوئی الزام نیا دو یارو

اک کرم یہ تو کرو حالِ پریشاں پہ مرے
اب تو اک یار مجھے غیر بنا دو یارو

کچھ تو ہو کرب کی شدّت میں کمی کا احساس
کوئی میری ہی غزل مجھ کو سنا دو یارو

نام سیفی کا اگر باعثِ بدنامی ہے
ہو سکے تو اسے محفل سے اٹھا دو یارو

○

تڑپانے لگی اب تو انکھیں میری کبھی بھی
اس بات کا افسوس بھی ہے مجھ کو خوشی بھی

شائستہ روی حسن ہے کردار کا لیکن
اس دور میں اک جرم ہے شائستہ روی بھی

تسلیم کہ ہیں حسن کی قدریں بھی مسلّم
اس کے لئے لازم ہے مگر خوش نظری بھی

یہ تلخیٔ حالات کا عالم ہے کہ توبہ
اس عرصے میں وہ یاد نہیں آئے کبھی بھی

حق گوئی کی جرأت کے لبادوں میں لپٹ کر
اب شاملِ تہذیب ہوئی بے ادبی بھی

سیفی کو ہر اک دیکھنے والے نے یہ دیکھا
ہونٹوں پہ تبسم کبھی تھا آنکھوں میں نمی بھی

ہاں نظر وہ ہے جو مصروفِ نظارہ بھی نہیں
اور جلوؤں کو حجابات کا یارا بھی نہیں

خال ہی خال کو ہوتی ہے سعادت یہ نصیب
غم کی دولت پہ ہر اک کا تو اجارہ بھی نہیں

ہائے وہ غم کہ جو بخشا ہے وہ کرم سے اپنے
ہائے یہ ہم کہ وہ غم ہم کو گوارا بھی نہیں

اہلِ دنیا ترا انکار بھی کرتے ہیں ادھر
اور بے نام لئے تیرا گزارا بھی نہیں

دوستو حسن کا اک حسن تغافل بھی تو ہے
وہ تمھارا جو نہیں ہے تو ہمارا بھی نہیں

کاش ملتا ہمیں وہ ظرف کہ ہم کہہ سکتے
ہم نے اوروں کو مصیبت میں پکارا بھی نہیں

اُس کو طوفان کی شدت کا ہو کیا اندازہ
جس نے کشتی کو سمندر میں اتارا بھی نہیں

میری خاکسترِ دل ہے یہ مجھے حیرت ہے
اس میں کیا میرے خدا کوئی شرارہ بھی نہیں

پڑھ سکیں دیکھ کے ہم جس کو مقدر کا لکھا
ان ستاروں میں کوئی ایسا ستارہ بھی نہیں

کیوں چلے ضد میں مری بادِ خزاں کے جھونکے
اپنے گلشن کو ابھی میں نے سنوارا بھی نہیں

اہلِ ساحل سے کوئی کاش یہ پوچھے صفی
کیا تمھیں ڈوبنے والے نے پکارا بھی نہیں

○

ہو منفرد مرا انداز فکر و فن یارب
مری روش نہ کبھی رسمِ عام تک پہنچے

مرے نصیب کی بربادیوں کا افسانہ
یہ خوف ہے نہ کہیں اُن کے نام تک پہنچے

تصورِ رُخ و گیسو جنھیں نصیب نہ تھا
وہ صبح تک ہی گئے ہیں نہ شام تک پہنچے

ملا ہمیں تو نہ آسودۂ تمام کوئی
جہاں کہیں بھی گئے تشنہ کام تک پہنچے

ہو تیرے درد کا سوز تمام جسکا نصیب
وہ فکر بھی مرے حسنِ کلام تک پہنچے

مری نوا کا جو حصہ ہو مثلِ بانگِ درا
خدا کرے کہ ہر اک خاص و عام تک پہنچے

مرے پیام کی ہر ذہن تک رسائی ہو
ہر ایک ذہن کبھی میرے پیام تک پہنچے

حیات و موت نہیں ہیں کچھ اور اسکے سوا
کہ اضطراب سکونِ دوام تک پہنچے

حضورِ شافیٔ مطلق دعا ہے سیفی کی
ترا کرم مری صحت کے جام تک پہنچے

شعورِ خاص کی پھر کیا اہمیت سیفی
شعورِ خاص اگر ذہنِ عام تک پہنچے

زندگی میں کوئی جینے کی ادا رکھتے نہیں
وہ جو پہلو میں دلِ درد آشنا رکھتے نہیں

انکی فطرت ہے بھلا دینا مگر ہم اہلِ ظرف
آشنا ہیں اُنکو کبھی دل سے جدا رکھتے نہیں

کچھ خطا ہو تو بتا دیجئے کہ صبر آجائے گا
آپ ملنا تک کبھی ہم سے کیوں روا رکھتے نہیں

ہاں فقط "امروز" رہتا ہے ہمارے سامنے
ہم غمِ "فردا" میں خود کو مبتلا رکھتے نہیں

بیکسی میں وہ تو کام آتے ہیں جن پر حق نہو
جن پہ حق ہو وہ تعلق بھی ذرا رکھتے نہیں

اپنی خودداری بھی اپنی شان استغنا بھی ہے
ہم خدا کے فضل سے دامن میں کیا رکھتے نہیں

ہم شریکِ غم بھی ہیں سب کے شریکِ عیش بھی
اور ہوں گے غم میں جو ملنا روا رکھتے نہیں

تم کو سیفی بات کرنے کا سلیقہ چاہیے
تم شعورِ عرضِ شوق و مدعا رکھتے نہیں

○

شاید کوئی ماحول ہمیں پھر سے پکارے
غربت میں کھڑے سوئے وطن دیکھ رہے ہیں

کیا تم بھی کسی کے لئے تھے رات پریشاں
آنکھوں میں شبِ غم کی تھکن دیکھ رہے ہیں

بے لاگ جو اک بات کہی ہے تو جواباً
ہم وقت کے ماتھے پہ شکن دیکھ رہے ہیں

رشتہ ہی کچھ ایسا ہے جو ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے
ہم اِن کو، ہمیں دار و رسن دیکھ رہے ہیں

اِن چاند ستاروں کی نگاہیں نہیں تھکتیں
پیہم ترا چاندی سا بدن دیکھ رہے ہیں

یوں تیری اداؤں نے سنوارا ہے مجھے بھی
سب میری طرف سب ہمہ تن دیکھ رہے ہیں

○

شدتِ غم کبھی یہ مانا کہ بری شے ہے مگر
ضبط گر یہ کو کبھی ہاتھوں سے نہ کھونا ہوگا

کہہ رہی ہے یہ محبت کی کسک رہ رہ کر
ہجر کی رات ہے کانٹوں پہ بھی سونا ہوگا

دیکھئے اپنے تغافل پہ پشیماں ہو کر
آپ کو بھی مرے حالات پہ رونا ہوگا

یہ گماں بھی نہ تھا وہ ترکِ وفا کریں گے
کیا خبر تھی کہ جو ممکن تھا "نہ ہونا" "ہوگا"

عظمتِ ضبطِ الم کی قسم اے چشمِ وفا
سامنے ان کے نہ پلکوں کو بھگونا ہوگا

آنسوؤں ہی کو جو ٹھہرائیے سرمایۂ زیست
ہر مسرت کو بھی اشکوں میں سمونا ہوگا

ڈھونڈھ لے گا تمھیں سیفی کرمِ ربِّ غفور
داغِ عصیاں عرقِ شرم سے دھونا ہوگا

○

دھجیاں دامنِ گل کی ہوں عبارت جس سے
روز ایسی ہی سحر ہو یہ ضروری تو نہیں

مقصدِ زیست تری یاد میں گم رہنا ہے
مجھ کو دنیا کی خبر ہو۔ یہ ضروری تو نہیں

بندگی ذوق ہے، پابند نہیں سجدوں کی
بندگی کے لئے در ہو یہ ضروری تو نہیں

عشرتِ جلوہ ہے درکار نگاہوں کو مری
آئیں وہ اور مرا گھر ہو۔ یہ ضروری تو نہیں

سب کی نظریں مری نظروں کو کہاں پہنچیں گی
ہر کوئی اہلِ نظر ہو۔ یہ ضروری تو نہیں

ذہن کو حسن کا احساس ہی کافی ہے تو پھر
حسن پر صرفِ نظر ہو یہ ضروری تو نہیں

بزعمِ خویش ابھی فقط آشنا نہ سمجھ
ہر ایک شخص کو دنیا میں بے وفا نہ سمجھ

ہیں تیرے ذہن پہ کیوں بوجھ بن کے چھا جاؤں
جو ہو سکے تو ابھی میرا مدعا نہ سمجھ

بجا کہ مجھ کو فغاں سے سکون ملتا ہے
مگر فغاں کو مرے درد کی دوا نہ سمجھ

ترا کرم جو مجھے مطمئن نہ کر پائے
اُسے تو اپنی طرف سے کوئی عطا نہ سمجھ

اب اس مقام پہ لے آئی شدّتِ احساس
کہ میری عرضِ تمنا کو ناروا نہ سمجھ

کبھی تو اپنی بھی کوتاہیٔ عمل پہ نظر
ہر ایک بات کو تقدیر کا لکھا نہ سمجھ

مجھے دعاؤں کی توہین مار ڈالے گی
مری تمام تمناؤں کو دعا نہ سمجھ

اگر ضمیر کا آئینہ صاف ہے تیرے
تو خود کو بھول کے بھی لائقِ سزا نہ سمجھ

تجھے جو اپنے تغافل کی لاج رکھنی ہے
تو میرے اپنے تعارف کو غائبانہ سمجھ

سنبھل نہ سکتا ہو اوروں کے غم پہ جو سیفی
اسے کبھی بھی دلِ درد آشنا نہ سمجھ

○

کاروانِ فکر کا اک موڑ پہ جا کر ٹھیرے
زندگی تیرے لئے کوئی تو محور ٹھیرے

اذنِ پرواز ہے سب کو بہ ایں بے بال و پری
اور ہم وقت کے شاہین بھی بے پر ٹھیرے

میرا آنسو ہے کہ رودادِ غمِ کون و مکاں
یہ وہ قطرہ ہے کہ پھیلے تو سمندر ٹھیرے

رہنمائی سے کسی کی بھی نہ پائی کوئی راہ
میرے افکار ہی تھے جو مرے رہبر ٹھیرے

کوئی احساس نہ تھا کیفیتِ غم کا جنھیں
ان کے الفاظ دلوں کے لئے نشتر ٹھیرے

ہاں جنھیں دولتِ بیداریٔ احساس ملی
صرف وہ لوگ ہی دنیا میں تونگر ٹھیرے

سنگ ریزوں کو بھی جن ہیروں نے بخشی ہے ضیا
نگہہ کم نظر اں میں وہی پتھر ٹھیرے

اب مجھے اور کسی شے کی ضرورت بھی نہیں
ہر طرح آپ ہی جب میرا مقدر ٹھیرے

○

کچھ خوشی میں تو نہیں با چشمِ نم پی ہے شراب
بھول جانے کے لئے دنیا کے غم پی ہے شراب

دوستو! میرا جوازِ میکشی بھی کم نہیں
میں نے رکھنے کو تمہارا ہی بھرم پی ہے شراب

ایک مدہوشی مسلسل راس آئی ہے مجھے
دل میں جب جاگے ہیں میرے رنج و غم پی ہے شراب

مجھ پہ ایسے وقت بھی آئے ہیں تیرے ہجر میں
لمحہ لمحہ، لحظہ لحظہ، دم بہ دم پی ہے شراب

یوں تصور نے ترے سرمست رکھا ہے مجھے
لوگ یہ سمجھے کہ میں نے ہر قدم پی ہے شراب

میں بھی کاشفؔ کی طرح محتاط ہوں سیفیؔ بہت
اشک ہی پیتا ہوں اکثر میں نے کم پی ہے شراب

جناب کاشف اندوری مرحوم جن کی غزل سے متاثر ہو کر یہ غزل کہی گئی۔

ہیں آپ کچھ بھی تو ہر ہر قدم حریف ہیں لوگ
جو کچھ نہیں ہیں تو بس نام کے رفیق ہیں لوگ

لگا کہ اپنی ہی بستی میں جیسے جا اترے
ترے نگر میں مزاجاً بڑے لطیف ہیں لوگ

ہمارا شہر ہمارا ہی شہر ہے لوگو!
ہمارے شہر میں ہر ہر طرح شریف ہیں لوگ

زبانِ حال نے جانے کیا تھا کیا جادو
نظر اٹھائی تو دیکھا بہت خفیف ہیں لوگ

ہر ایک تجربہ رائے بدل رہا ہے مری
سمجھ رہا تھا کہ شائستہ و شریف ہیں لوگ

ہوئی ہے جرأتِ حق گوئی مصلحت اندیش
خفیف، بزدل و شرمندہ و ضعیف ہیں لوگ

یہ قافیہ تو کچھ ایسا بُرا نہ تھا لیکن
یہ اس زمین کی قسمت ملی "ردیف ہیں لوگ"

خلوص و مہر و مروت کے نام پر سیفی
دلاسے دیتے ہیں کیسے ستم ظریف ہیں لوگ

○

حق ادا جینے کا کرتے ہی رہے
روز کا مرنا تھا مرتے ہی رہے

نام کے اپنوں نے دیں وہ تلخیاں
عمر بھر اپنوں سے ڈرتے ہی رہے

ہر قدم دشواریوں کے باوجود
زندگی کے دن گزرتے ہی رہے

غم پہ غم دنیا ہمیں دیتی رہی
لمحہ لمحہ ہم سنورتے ہی رہے

لاکھ ان کو بھولنا چاہا مگر
نقش ماضی کے ابھرتے ہی رہے

کم نگاہی کی شکایت بھی نہ کی
ان کی راہوں سے گزرتے ہی رہے

آزمائش ہی رہی اپنا نصیب
زندگی بھر ہم نکھرتے ہی رہے

لاکھ پہرے تھے وفاؤں پر مگر
دم وفا کیشی کا بھرتے ہی رہے

ضبط غم کا بھی سلیقہ تھا ہمیں
پھر بھی کچھ موتی "بکھرتے ہی رہے

○

محرومیوں کو اپنی چھپا کر غزل کہی
ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر غزل کہی

کیفیتوں سے لطف اٹھا کر غزل کہی
جب بھی کہی ہے وجد میں آ کر غزل کہی

کشتِ غزل کو سینچا ہے یوں اپنے خون سے
شعروں میں لفظ لفظ سجا کر غزل کہی

آنے دیا نہ حرف ترے نام پر کوئی
ہر مصلحت کو کام میں لا کر غزل کہی

"میں ہی غزل ہوں" میری غزل یہ پکار اٹھی
میں نے ترے قریب جو آکر غزل کہی

اپنی غزل کو میں نے غزل کا دیا مزاج
تیور ترے غزل میں سجا کر غزل کہی

آفاقیت غزل کو مری یوں ہوئی نصیب
میں نے ہر ایک ذہن پہ چھا کر غزل کہی

جب بھی ہوئی غزل کو تغزل کی احتیاج
تیرا خیال ذہن میں لا کر غزل کہی

روداد غم سنائی یہ پیرایۂ غزل
امڈا ہے دل تو اشک بہا کر غزل کہی

وہ نظر کس کس طرح تسکین کا ساماں ہوگئی
پہلے پہلے جاں بنی، پھر جاں سے جاناں ہوگئی

اُف مری آزاد فطرت پر یہ پہرے الاماں
زندگی شائستۂ آدابِ زنداں ہوگئی

جس نظر نے مجھ کو بخشا تھا غموں کا حوصلہ
وہ نظر کبھی جانے کیوں مجھ سے گریزاں ہوگئی

اسکی راحت کیسی راحت تھی ذرا یہ سوچئے
جسکی بے چینی ہی بڑھ کر وجہ درماں ہوگئی

اللہ اللہ فطرت انساں کی مشکل کیشیاں
زندگی دشواریوں میں گھر کے آساں ہوگئی

صرف یہ احساس ہے تسلی کہ انکی بھی نظر
دیکھ کر اس حال میں مجھ کو پریشاں ہوگئی

○

زندگی کے دامن میں پھول بھی ہیں کانٹے بھی
کوئی تجھکو چمکارے، کوئی تجھکو ڈانٹے بھی

میرے حال پر دنیا میرے ساتھ روئی تو
یہ بتاؤ دنیا نے میرے درد بانٹے بھی

پھول توڑنے والو، اے ہوس کے متوالو
پھول کی حفاظت کو جاگتے ہیں کانٹے بھی

زندگی نہ بننے کی بے سبب شکایت کیوں
تم نے غم تلاشے بھی، تم نے درد چھانٹے بھی؟

○

اے میرے مسیحا نہ دوا دے نہ دعا دے
دامن کی ہوا دے ، مجھے دامن کی ہوا دے

غم ہوتے ہیں سہنے ہی کو ہمت جو خدا دے
جینے کی ضمانت نہیں کمزور ارادے

یہ سوچ کے اک آہ کو برباد کیا تھا
شاید کوئی آواز میں آواز ملا دے

لیکن مری تقدیر ہے یہ تنہا نوائی
کوئی کبھی نہیں ہے جو مرا ساتھ نبھا دے

میں نے سبھی چہروں سے الٹ دی ہیں نقابیں
دنیا مجھے اس جرم کی جو چاہے سزا دے

تری ہی صدا آئیگی کانوں میں پلٹ کر
اچھا ہے کسی کو نہ مصیبت میں صدا دے

وہ جنکو مری زیست گوارا نہیں اے دوست
جا میری طرف سے انھیں جینے کی دعا دے

اے اہلِ طلب، راہِ طلب چھوڑ نہ دینا
منزل پہ نہ پہنچائیں گے بدلے ہوئے جادے

سیفی تجھے دنیا نے ترے غم سے نہ سمجھا
تو اپنے غموں کو کوئی عنوان نیا دے

○

رہ کر ترے التفات سے دور
زندہ ہوں مگر حیات سے دور

کچھ دیر کو اے مرے تصور
لے چل مجھے کائنات سے دور

اللہ! غمِ جہاں کا جادو
وہ اور تصوّرات سے دور!

اچھا ہے کہ رہیو اے تصوّر
گزرے ہوئے واقعات سے دور

دنیا تو رہی ہے اور رہے گی
ہم جیسے جنوں صفات سے دور

وحشت لئے پھر رہی ہم کو
انسانوں کے خیالات سے دور

رہیو اگر ہو سکے تو اے دل
بے وجہ نوازشات سے دور

آئیں کبھی اور ہمیں بھی دیکھیں
رہتے ہیں جو مشکلات سے دور

وہ زندگی کوئی زندگی ہے
یکسر ہو جو حادثات سے دور

جینے کا مزہ ہی کیا۔ اگر ہو
جینے کے لوازمات سے دور

کیوں آج کا دور ہو گیا ہے
انوارِ تجلیات سے دور

ذہنوں پہ ہیں ظلمتیں مسلّط
انسان ہے نورِ ذات سے دور

غرورِ حسن ہو تم، عشق کا غرور ہوں میں
نہ بے قصور رہو تم اور نہ بے قصور رہوں میں

نہ مجھ سے دور رہو تم، اور نہ تم سے دور ہوں میں
تو پھر یہ کیوں ہے کہ ہر وقت ناصبور ہوں میں

نجانے وقت کے ہاتھوں میں کتنے خنجر ہیں
برس رہے ہیں لگاتار چور چور ہوں میں

ہیں تابناک بہت میری فکر کے انجم
جو ظلمتوں میں نہ گم ہو اک ایسا نور ہوں میں

"وجود" ہی تو مرا موت چھین سکتی ہے
کبھی جو مر نہیں سکتا وہ اک شعور ہوں میں

نہیں ہے اور تو کوئی خطا مری سیفی
گناہگارِ محبت مگر ضرور ہوں میں

ختم کرے ہے جلتے بھنتے دن کا راج سہانی شام
لیکن خود بھی کھو جاتی ہے تاریکی میں دھانی شام

انکا ساتھ یہ کیسا چھوٹا دن کاٹے ہے رات ڈسے
اور بالکل بیگانی لگے ہے اب جانی پہچانی شام

پہلے ان کا سندیسہ لیکر آتی تھی یہ لیکن اب
من سمجھانے آجاتی ہے روز کی آنی جانی شام

صبح بنارس جیسی رونق والا سویرا ڈوب گیا
جسمیں اودھ کی رعنائی تھی اب وہ کہاں مستانی شام

عمر کو پہروں کی یوں اب تک کس نے سوچا سمجھا ہے
دن بچپن ہے رات بڑھاپا پہروں کی ہے جوانی شام

جلتی دھوپ اچھلنے پھرے محنت مزدوری، فاقے
روز سنا دیتی ہے آکر ایسی ایک کہانی شام

انکے سلونے روپ کے آگے اس کا جوبن پھیکا ہے
دیکھ کے ان کو ہو جاتی ہے شرم سے پانی پانی شام

بھارت کی شاموں کو بالکل ہندوستانی ہونا تھا
لیکن اپنی ساری لعنت چھوڑ گئی نصرانی شام

جانے کس کی کھوج میں دن بھر ماری ماری پھرتی ہے
رات کو تھک کر سو جاتی ہے پھر بیتی، دیوانی شام

ہم نے تری طلب میں ہر رہ گذر کو دیکھا
ہر مرحلے سے گزرے ہر خشک و تر کو دیکھا

زندانیٔ خرد کیوں توہین کی جنوں کی
اڑنے سے پہلے تو نے کیوں بال و پر کو دیکھا

میری تباہیوں کے اسباب پوچھتے ہو
میری نظر سے تم نے اپنی نظر کو دیکھا؟

اُن مسکراہٹوں کو آئے بڑے سلیقے
جن مسکراہٹوں نے زخمِ جگر کو دیکھا

دیوار و در کے پیچھے بھی بے پناہ رونق
دنیا نے صرف حسنِ دیوار و در کو دیکھا

یہ حادثات پیہم رہ رہ کے کہہ رہے ہیں
پھر دفعتاً کسی نے شاید اِدھر کو دیکھا

منزل ہوئی مقدر ان قافلوں کا سیفی
جن قافلوں نے میری گردِ سفر کو دیکھا

تیکھے تیور، میٹھی بات
غم سمجھے الفت کے عنوانات

قاتل ہونے کی جانے تک تو
دشمن ہیں یہ بیں احساسات

حسن کا دامن بالکل ستھرا
عشق کے سر سب الزامات

اُن کے جلوے، میرا آنگن
یہ ہوتی ہے چاندنی رات

غم اور پھر شائستگی غم
انکی نظر کے احسانات

ان کے غم نے عزت بخشی
یاروں کی تھی کیا اوقات

دل میں تڑپ، غم، درد، کراہیں
یا قسمت ہے یا سوغات

میرے آگے میرے مسائل
ان کے آگے ان کی بات

انکی خوشی منظور تھی ہم کو
اپنی خوشی سے کھائی مات

اب میں نہ انکا اور نہ اپنا
ہائے یہ میری کیفیات

موت کے آتے آتے سلیمؔ
ختم ہوئے سب امکانات

○

ہمیں ضرور ملیں گے وہ ہم اگر ڈھونڈھیں
مگر یہ شرط ہے سیفی کہ راہ پر ڈھونڈھیں

ہے ظلمتوں میں بھٹکنے کا کیا جواز اے دل
کہیں سے نور اگائیں، کوئی سحر ڈھونڈھیں

مچل رہی ہے ابھی اور حسرتِ پرواز
یہیں گرے تھے کہیں اپنے بال و پر ڈھونڈھیں

طمانیت کا حسیں دور آگیا کہ نہیں
لکھی ہوئی کسی چہرے پہ یہ خبر ڈھونڈھیں

یہ اعتبار کی دنیا بھی کھوکھلی نکلی
کدھر کو جائیں۔ کہاں کوئی معتبر ڈھونڈھیں

وہ ایک بار نظر آ کے چھپ گئے گویا
یہ کہہ گئے ہیں کہ ہم ان کو عمر بھر ڈھونڈھیں

سرور و کیفِ جنوں کا تو یہ تقاضہ ہے
وہ سامنے ہوں انھیں پھر بھی دربدر ڈھونڈھیں

تلاشِ یار ہے سامانِ زندگی سیفی
جنوں کی خیر منائیں نگر نگر ڈھونڈھیں

○

زندگی تیرے لئے ہم نے گنوائی اک عمر
تو مگر ہاتھ نہ آئی کبھی نہ آئی اک عمر

شرطِ پابندیٔ آئینِ وفا اور غمِ جاں
ایسے حالات میں دنیا سے نبھائی اک عمر

مدتوں اپنی وفا کیشی پہ مطعون رہے
لوگ دیتے ہی رہے ہمکو برائی اک عمر

اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور مصیبت ہوگی
یاد تیری بھی مرے کام نہ آئی اک عمر

حرف برسوں بھی ترے نام پہ آنے نہ دیا
اپنی روداد کسی کو نہ سنائی اک عمر

آخرِ شب وہ بھی دن آیا کہ وہ پلکیں بھیگیں
یہ بجا دادِ وفا ہم نے نہ پائی اک عمر

مجھ پہ لہجے کی لطافت نے بڑا ظلم کیا
لوگ سمجھے نہ مری تلخ نوائی اک عمر

میں کہ خود اپنی طلب ہی میں رہا سرگرداں
تجھ سے بھی رہی خود سے بھی جدائی اک عمر

○

مری ہمتوں نے بنائے ہیں جادے
مرے کام آئے ہیں میرے ارادے

تری لاج رکھنے کو لب سی لئے ہیں
زمانے مرے حوصلے کو دعا دے

میں دنیا کو نزدیک سے دیکھتا ہوں
اگر یہ خطا ہے تو دنیا سزا دے

غموں پر کرے صرف کیوں آنسوؤں کا
کوئی اپنی دولت کو کیسے لٹا دے

ڈرا ہے یہ سوچوں کہ حیراں کھڑا ہوں
نہ دنیا سزا دے، نہ مالک جزا دے

بھلا کر اُنھیں مسکرا بھی سکوں میں
یہ ہمت خدا دے۔ یہ ہمت خدا دے

غمِ زندگی سے یہ خطرہ ہے ساقی
مرے راستوں میں نہ کانٹے بچھا دے

دعاؤں کا تو نہ تھا مقدر کہ ان کو ملتی اثر مزاجی
مری شبوں کو ملی ہوئی ہے مگر ازل سے سحر مزاجی

کسی کبھی حساس دل کی محفل میں سوز کا نور کیسے ہوتا
جو فطرتِ اشک میں نہ ہوتیں یہ تابشیں یہ گہر مزاجی

یہ سبزہ زار اور یہ صحنِ گلشن، کہاں یہ دادِ خرام دیتے
خرام ہے جب ادائے جاناں، تو دل کو دے رہگذر مزاجی

بسیط اور بیکراں فضائیں مرا مقدر نہ تھیں تو یا رب
سرشتِ شاہیں عطا ہی کیوں کی؟ عذاب ہے بال و پر مزاجی

نہ سرد آہیں اثر کی ضامن نہ شورِ نالہ میں کوئی جادو
ہے آہ و نالہ کا کوئی جوہر تو صرف انکی شرر مزاجی

جس آگہی سے بشر ہے خود سر وہ آگہی جہل ہے سراسر
اس آگہی کو نہیں میسر۔ قسم خدا کی خبر مزاجی

اسی میں شانِ پیمبرانہ، اسی میں اندازِ کافرانہ
تناقضی ہے کیا معمہ، بشر اور اس کی بشر مزاجی

آیئے فکر کا انداز ہی بدلا جائے
تیرِ تنقید کا خود پر ہی چلایا جائے

زندہ رہنے کو ضروری ہے اگر ہنسنا بھی
تو یہ بہتر ہے مذاق اپنا اڑایا جائے

نہ نکل پائے تو احباب پہ حرف آئے گا
ذہن میں کوئی کبھی ارمان نہ پالا جائے

کوئی غمخوار اگر ہے تو ہمیں جیسا ہے
کسی غمخوار کو بے لاگ نہ پرکھا جائے

زندگی ایک معمہ ہے گزرنے کیلئے
اس معمے کو سمجھنے میں نہ الجھا جائے

کوئی وعدہ ہی نہ کر مجھ سے کہ ایسا تو نہ ہو
بات جائے تری اور میرا بھروسہ جائے

میرے الفاظ تو شاید مری تشریح نہیں
مجھے آئینۂ حالات میں دیکھا جائے

راستے جال بچھاتے ہیں تو یہ سوچتا ہوں
اُن کی نگری کی طرف بھی کوئی رستا جائے

کیوں کیا جائے دماغوں کو مکدر یوسفی
اپنا غم کس لئے احباب میں بانٹا جائے

○

منزل و کارواں کے تھے ہی نہیں
ہم جہاں ہیں وہاں کے تھے ہی نہیں

مسئلے سامنے ہواؤں کے
کشتی و بادباں کے تھے ہی نہیں

آ کے مرجھا گئے مزاروں پر
پھول تو گلستاں کے تھے ہی نہیں

اس طرح ہم جیے ہیں دنیا میں
جیسے ہم اس جہاں کے تھے نہیں

مبتلا کیوں ہیں امتحان میں ہم
اہل جب امتحاں کے تھے ہی نہیں

میرے سجدوں کو کیا ہوا یارب
کیا کسی آستاں کے تھے ہی نہیں

اڑ گئے ہیں ہوا میں جو تنکے
وہ مرے آشیاں کے تھے ہی نہیں

ہم ستارے تو تھے مگر سیفی
قسمتِ کہکشاں کے تھے ہی نہیں

نظمیں

سلامِ شوق و حسرت

اپنی طویل علالت کے دوران اپنے آقا و مولا
حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی
بارگاہ بیکس پناہ میں ۔

سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا
یہ عرض کرنا کہ اے افتخار کون و مکاں
تمھارے واسطے جینے کا تھا جسے ارماں
وہ اک طویل علالت سے کھو چکا ہے تواں
شفا کے واسطے بے چین ہے وہ بے ساماں
مری شفا کی تمنا کا کارواں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا
یہ کہنا اس کے بھی جینے کا راستہ کوئی
کہ جس کی کوششیں بیکار ہو چکی ہیں سبھی
نہ کام آئی ہے جس کے ابھی کوئی تدبیر،
ہے جس کی آس فقط اب حضور ہی سے لگی

نہ وقت کھو مری باتیں رواں دواں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا

مرا پیام ہوائیں کچھ ایسے پہنچائیں
مرا فسانۂ غم سن کے وہ تڑپ جائیں
مجھے وہ اپنی حضوری میں خود ہی بلوائیں
نہیں تو مجھ پہ ترس کھا کے خود چلے آئیں

مرے کلام کے بدلے مری زباں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا

مرا بھرم جو سحر خیز آہ رکھ لیتی ،،
ترا ہی عطا مری شرم گناہ رکھ لیتی
جبیں کی لاج تری سجدہ گاہ رکھ لیتی
مجھے نگاہ میں تیری نگاہ رکھ لیتی

یہ میری شرم و عقیدت کا ارمغاں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام، مرے غم کی داستاں لے جا

نہ ہو کہ شدت غم سے ہلاک ہو جاؤں ،
ہجوم یاس سے خود سینہ چاک ہو جاؤں

یہ چاہتا ہوں کہ اس در کی خاک ہو جاؤں
نگاہ انکی پڑے اور پاک ہو جاؤں
یہ عرضداشت نہ ہو جائے رائیگاں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا

عذاب کرب کا کھیو دل پہ چل گیا آرا
یہ دل تو ہوتا فقط ان کے غم کا گہوارہ
مجھے طویل علالت نے اس طرح مارا
کہ ناتوانی سے نالوں کا بھی نہیں یارا
بشورت میں یہ لرزتی ہوئی فغاں لیجا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام مرے غم کی داستاں لے جا

غموں کے بار مسلسل ہیں اور بے جا ہیں
شکستگی کے یہ حالات روح فرسا ہیں
مری فغاں کے بھی انداز جانے اب کیا ہیں
کہ میرے نالے بھی اس وقت آبلہ پا ہیں
تو اپنے دوش پہ نالوں کا کارواں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام۔ مرے غم کی داستاں لیجا

مری طویل علالت مری تباہی ہے
یہ میری شکل مرے حال کی گواہی ہے
یہ سوچتا ہوں، یہ انکی عدم نگاہی ہے
مگر نہیں یہ مرے بخت کی سیاہی ہے
انھیں دکھانے کو میری تباہیاں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام، مرے غم کی داستاں لے جا

یہ عرض کرنا کہ شیفتی غموں کا مارا ہے
برا ہزار سہی ۔ پھر بھی وہ تمھارا ہے
وہ آسمانِ عقیدت کا اک ستارا ہے
یہ حال اس کا تمھیں کسطرح گوارا ہے
تو ان کے پاس مرا دردِ بیکراں لے جا
سلام شوق مرا اے صبا وہاں لے جا
مرا پیام، مرے غم کی داستاں لے جا

علامہ اقبالؒ کے ایک شعر

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

سے متاثر ہو کر کہے گئے چند مسلسل اشعار بعنوان

مقامِ آدم

کیوں بنائے یہ زمین و آسماں میرے لئے
تو نے کیوں تخلیق فرمایا جہاں میرے لئے
میری ذمہ داریاں تیرے جہاں کی بہتری
تیری بخشش صرف جانِ ناتواں میرے لئے
بے نیازی وقف کر لی تو نے اپنے واسطے
اور ہر اندیشۂ سود و زیاں میرے لئے
پھر کبھی مجھ سے کام لینا ہے تو اتنا مان لے
غم نہیں بڑھ جائیں گر دشواریاں میرے لئے
میری فطرت کا تقاضہ ہے تلاش و جستجو
خود نہ کہنا رازِ سربستہ عیاں میرے لئے
میری جانِ ناتواں ذوقِ تجسس سے قوی
اس کے دم سے سہل ہے ہر امتحاں میرے لئے

فرض میرا ہے ذوقِ جستجو کی تربیت
منکشف خود ہوں گے اسرارِ نہاں میرے لئے

جانار کی سنسان وادی میں تجسس نے مرے
کر دیا آباد اک تازہ جہاں میرے لئے

دیکھ یہ ذوقِ عمل کا ایک ادنیٰ سا کمال
راہ بنجاتا ہے بحرِ بیکراں میرے لئے

اپنی جنت سے مجھے تو نے نکالا ہے تو کیا
یہ زمیں بنجائے گی رشکِ جناں میرے لئے

امتحاں میرا اگر کرنا ہو تیرے مدِ نظر
آگ بن سکتی ہے اب بھی گلستاں میرے لئے

پردۂ لاہوت تیرا چاک ہے میرے ہاتھ سے
جادۂ منزل بنی تھی کہکشاں میرے لئے

میری ہستی آشنائے سختیٔ قیدِ وجود
لامکاں تیرے لئے ہے اور مکاں میرے لئے

ہے ترا بارِ خلافت صرف میرے دوش پر
میں ہوں تیرے واسطے تیرا جہاں میرے لئے

اب اگر تیری عنایت بھی ہو میرے حال پر
پھول ہو جائے گا یہ بارِ گراں میرے لئے

○

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا شعر سے متاثر ہو کر کہے گئے چند مسلسل اشعار۔

وارث میراث عالم! تو نے یوں سوچا نہیں
تو اگر کچھ بن سکے تو کیا سے کیا ہو جائے گا
تیری نظریں چاک کر دیں گی نقاب کائنات
تو اگر اپنا حقیقت آشنا ہو جائے گا
کاروانوں کو جگا دے گی تری آہ سحر
تیرا نالہ شورش بانگ درا ہو جائے گا
تیری جولانگاہ ہو گی وسعت ارض و سما
کاروان ماہ و انجم گرد پا ہو جائے گا
قوت تسخیر ہے تیرے ارادوں میں نہاں
تیرے ہر اقدام پر محشر بپا ہو جائے گا
حکم سے تیرے نہ سرتابی کرے گا رود نیل
اس کی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا

تو عرب میں ہو تو ایراں میں صدا ہو گی تری
بے حقیقت اس طرح ہر فاصلہ ہو جائیگا
تو مقام بندگی پیدا ہو سکے فائز اگر
دیکھتا ہے کس طرح سجدہ قضا ہو جائیگا
لوٹ کر آئے گا سورج تیرے سجدوں کے لئے
وقت پر اپنے ترا سجدہ ادا ہو جائے گا
فکر "صحت مند" حاصل ہو تو پھر انجام کار
تو ہی معبودان باطل کا خدا ہو جائے گا
ہر عمل تیرا اگر عین مشیت بن سکے
تو یہ دیکھے گا کہ یزداں ہمنوا ہو جائے گا

جرأت گستاخ

تو نے کیوں ہنگامۂ ہست و عدم برپا کیا
خیر جو کچھ بھی کیا، اچھا کیا۔ اچھا کیا

حسن کی اتنی نمائش عالم امکان میں
کچھ بتا کیوں تو نے اپنا اس قدر چرچا کیا

شوخیٔ خلاقیت کی یہ کرشمہ ساز یاں
خود ربا معبود اور مخلوق کو بندہ کیا

اللہ اللہ عشق کی سرمستیوں کا طمطراق
تیرا جلوہ اور مجھ کو عمر بھر دیکھا کیا

سرمد و منصور کے انداز میں بے ساختہ
میری ہمت دیکھ میں نے خود کو خود رسوا کیا

میں کہ خود اپنی ہی کیفیات سے مجروح تھا
تو نے میرے دل میں اپنا درد کیوں پیدا کیا

تو بھی میں ہوں میں بھی تو ہے پھر یہ کیسا اضطراب
یہ حجاب درمیاں کیوں، ہائے تو نے کیا کیا

"یوم تاشقند" منعقدہ ۲۶ فروری ۶۶ء کے موقع پر ٹاون ہال امرتسر میں پڑھی گئی

ہم یہ ہے احسان تیرا اے زمین تاشقند
ہم سبھی کیا سارا زمانہ ہے ترا احسان مند
لو مبارک امن کے اعلان کا دن آگیا
اہلِ ہند و پاک اطمینان کا دن آگیا
صدرِ پاکستان، وزیرِ اعظمِ ہندوستاں
جاوداں تھے جاوداں ہیں جاوداں ہیں جاوداں
روس کا حسن تدبر کام آخر آگیا
امن کا ہاتھوں میں سب کے جام آخر آگیا
پھر فضائے امن دنیا کی فضا پر چھا گئی
جنگ بازوں کو ہمیشہ کے لئے نیند آگئی
نقشۂ بربادیٔ عالم بدل کر رہ گیا
جنگ کی زنجیر کا لوہا پگھل کر رہ گیا
ساری دنیا میں یہ لعنت بٹتے بٹتے رہ گئی
شہ رگِ امن زمانہ کٹتے کٹتے رہ گئی
ہے فضا مجبور اپنا رخ بدلنے کیلئے
کھیت آمادہ ہیں پھر سونا اگلنے کے لئے
مادرِ گیتی کے چہرے پر نکھار آیا ہے پھر
جھوم کر ہاں جھوم کر ابرِ بہار آیا ہے پھر

قطعات

سفر زیست معتبر کبھی نہیں
اور پھر یہ کہ مختصر کبھی نہیں
کرب ہی کرب ہے اگرچہ حیات
اس سے لیکن کوئی مفر بھی نہیں

○

میری پلکوں پہ گرم گرم آنسو
میرے حالات، میرے افسانے
میرے اشکوں کو اشک مت سمجھو
چند تحفے دیئے ہیں دنیا نے

○

مجھ سے دنیا ہے اگر ناراض آج
کل یہی دنیا مجھے دے گی خراج
میں تو اک دولت ہوں دنیا کیلئے
اس نے کب سمجھا ابھی میرا مزاج

○

اب ترے بعد یہ تری یادیں
دل میں طوفانِ غم اٹھاتی ہیں
اپنی یادوں کو دور رکھ مجھ سے
تیری یادیں بہت ستاتی ہیں

○

مجھ سے فرمائشِ غزل نہ کرو
ظلمتیں میری راہ تکتی ہیں
میرے شعروں کی درد ناکی پر
ان کی پلکیں بھی بھیگ سکتی ہیں

○

مجھے تیرے لیئے ہنسنا پڑا ہے
مرے نالے ترنم بن گئے ہیں
کیا ہے ضبط جن اشکوں کو میں نے
مرے لب پر تبسم بن گئے تھیں

سیفی کلاسیکی انداز کے شاعر ہیں۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے انھوں نے اساتذہ کا اتباع کیا ہے ان کا کلام انکی کاوش اور ریاض کا پتہ دیتا ہے خون جگر صرف کر کے وہ قدرت اظہار کی اس منزل تک پہنچے ہیں جہاں جذبہ اور خیال۔ لفظ اور معنی پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔ ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مرزا احمد حسین سیفی امروہوی کی غزلیات کے مطالعے سے ہم کو تغزل اور فطری جوش جسقدر ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "شعر گفتن" برائے "گفتن" کے بجائے صداقت، جذبہ منفرد آرٹ اور سچی شاعری کی امکانی کوشش کی ہے

مرتضیٰ حسین بلگرامی

سیفی کے یہاں بلا کا سوز ہے۔ وہ گداختگی ہے جو دلوں کو پگھلائے بغیر نہیں رہ سکتی جہاں ان کے کلام میں عاشقانہ بانکپن ہے وہاں لہجہ میں شگفتگی، رعنائی اور دلفریبی نمودار ہوئے بغیر نہیں رہتی ان کی غزلوں میں مرصع سازی نہیں بلکہ جگر کاوی ہے۔ ان کے الفاظ گنجینۂ معنی کے طلسم نہیں بلکہ اپنی شکست کی آواز ہیں۔ ان کا کلام ایک دردمند انسان کی آواز ہے جسے شدت احساس نے فریاد بننے پر مجبور کر دیا ہے

ڈاکٹر امام مرتضیٰ امروہوی

حضرت سیفی امروہوی

کا

مجموعہ نعت و مناقب

نگہتیں

انشاءاللہ بہت جلد منظر عام پر لایا جا رہا ہے

ناشر

زبیر مرزا